اکادمی
ادبیات
پاکستان
پاکستانی
ادب کے
معمار
محمد حسن عسکری
شخصیت اور فن
عزیز ابن الحسن

پاکستانی ادب کے معمار

محمد حسن عسکری
شخصیت اور فن

عزیز ابن الحسن

اکادمی ادبیات پاکستان

نگران اعلیٰ	افتخار عارف
منتظم	محمد انور خان
تدوین و طباعت	سعیدہ درانی
پیکج	احمد حبیب
اشاعت	2007
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد : -/155روپے پیپر بیک:-/140روپے

ISBN: 978-969-472-211-5

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز اہل قلم کے بارے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور نثر نگاروں، شاعروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

محمد حسن عسکری ایک صاحب اسلوب اور رجحان ساز افسانہ نگار، تنقید نگار، مترجم تھے۔ شاید ہی کوئی اور نقاد ہمارے ادب میں زیادہ موضوع گفتگو رہا ہو، جتنا محمد حسن عسکری رہے۔ وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم اور انتہائی لائق توجہ باب ہیں۔ ادبی حوالے سے یہ کتاب محمد حسن عسکری پر بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی تحریروں میں معاشرے کی بنیادی آفاقی انسانی قدروں کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کی تحریریں ان کی زندگی کی دیانت دارانہ عکاسی کرتی ہیں۔

پیش نظر کتاب "محمد حسن عسکری: شخصیت اور فن" ملک کی معروف محقق عزیز ابن الحسن نے بڑی توجہ اور محنت سے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب محمد حسن عسکری کی شخصیت اور فن کو متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ "پاکستانی ادب کے معمار" ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

برصغیر پاک و ہند میں ملت اسلامیہ کا تاریخی و تہذیبی سفر در حقیقت ایک تخلیقی سفر تھا جس میں محض حکومتی وانتظامی ادارے ہی قائم نہیں کیے گئے بلکہ تمدنی و کلچری اوضاع نے بھی فروغ پایا۔ اس سفر کے مختلف سنگ ہائے میل میں سے ایک عظیم ترین نشان منزل اردو زبان اور اس میں پیدا ہونے والا ادب ہے۔

کسی بھی عظیم سلطنت یا عمارت کو تعمیر کرنے والے اگرچہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں لیکن اکثر اسکی بنیاد میں کسی ایک شخص کی ذہنی و عملی کاوشوں کی کارفرمائی سب سے زیادہ ہوتی ہے اور وہی ایک شخص اس عمارت کا حقیقی معمار ہوتا ہے۔ اردو ادب بھی بلاشبہ ایک عظیم عمارت کے مشابہ ہے جس کے معماروں میں ایک طرف میر و غالب سے لیکر داغ اور اقبال تک کے نام آتے ہیں تو دوسری طرف نثری روایت کے کم معروف و نامور داستان گویوں سے لیکر رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین اور نذیر احمد تک کے خلاق نثر نگاروں کا بھی حصہ ہے۔

تاریخ و تہذیب کی مختلف قوتوں نے 1947 میں جب دو قومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر ہندوستان کو تقسیم کر دیا اور دنیا کے نقشے میں پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آ گیا تو ہند اسلامی تہذیب کی وہ وراثت، جس میں یہاں کے مسلمانوں کے مذہبی تصورات اور تمدنی اوضاع کی ہر صورت جلوہ گر تھی، اس کی حفاظت کی ذمہ داری پاکستان کے سر آ گئی کیونکہ یہ ملک انہی آدرشوں اور تصورات کی بقا اور تحفظ کے لیے ایک سیاسی حصار کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ ہند اسلامی تہذیب کا سب سے اہم اور نمائندہ اظہار چونکہ اردو زبان کی تخلیق کی صورت میں ہوا تھا اس لیے اردو زبان کو یہاں کی قومی زبان قرار دیا گیا، جو علامتی طور پر اس امر کا اظہار تھا کہ اس زبان میں محفوظ مسلمانان ہند کی ملی و اجتماعی روح مستقبل میں اپنے نئے اظہارات کی جو شکل اختیار کرے گی انہیں ہر اعتبار سے اپنی وجہ جواز کا آئینہ دار ہونا ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی یہاں پر پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کی جو بحثیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں وہ محض اتفاق کی بات نہ تھی بلکہ ان کے پیچھے صدیوں کا وہ اضطراب کارفرما تھا جو اپنے امتیازات کو کسی صورت مسخ نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔

برصغیر کے مسلمانوں اور ان کے پیدا کردہ تہذیبی اوضاع کے امتیازی خدوخال کا شعور رکھنے والے یوں تو بہت سے ادیب و شاعر تھے مگر قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ان امتیازات کو اپنے ادبی شعور کا حصہ بنا کر انہیں پاکستانی کلچر اور ادب کے خدوخال متعین کرنے کا جو کارنامہ محمد حسن عسکری نے سرانجام دیا اس کی دوسری نظیر اگر کوئی ہے تو انہی کے خطوط پر کام کرنے والے کچھ ادیبوں کی ہے۔ گذشتہ پچاس ساٹھ برس کے دوران ''پاکستانی ادب'' ایسے انفرادی خدوخال یقیناً بنا چکا ہے جو اسے ہندوستانی اردو ادب سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس ادب کو تخلیق کرنے اور اس کا امتیازی رنگ وضع کرنے میں بہت سے ادبا کا کردار ہے مگر محمد حسن عسکری کی ذہنی و نظریاتی کاوشوں نے ''پاکستانی ادب'' کی ضرورت، جواز اور امتیاز کی بات ایک ایسے دور میں کی تھی جب ہمارے عمومی ادبی شعور کے نزدیک اس کی حقیقت محض دیوانے کے خواب کی تھی۔ لہٰذا اس بناء پر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ''پاکستانی ادب'' کا حقیقی معمار اور بنیاد گزار اگر کوئی ہے تو وہ حسن عسکری ہے۔

آئندہ سطور میں مختلف ابواب کے تحت ہم اسی معمار ادب کی زندگی، ذہنی رجحانات اور ادبی تصورات کے بارے میں چند اشارات کریں گے۔ ان کی تصانیف اور ان پر لکھی گئی کتابوں کے جائزے میں بھی ہماری کوشش یہی ہوگی کہ عسکری کے ادبی و تنقیدی خیالات کے کچھ مزید گوشے سامنے لائیں۔

عسکری کے تنقیدی تصورات سے میری دلچسپی ایک عمر کا معاملہ ہے، مگر اس کتاب کی تحریر کا قرعۂ فال میرے نام نکلنا محض ایک اتفاقی امر تھا۔ ایک روز میں جناب افتخار عارف کی خدمت میں حاضر تھا۔ انہیں جب عسکری سے میرے شغف کا پتہ چلا تو ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے کے لیے محمد حسن عسکری پر یہ کتاب تیار کرنے کا حکم دیا۔ میں اگر گزشتہ دو تین برس کے دوران عسکری کی تنقیدی مہمات سے ازسرنو نہ گزرا ہوتا تو یہ بھاری پتھر اٹھانے کی کبھی جرأت نہ کرتا۔ لیکن اب فخر و عجز کے قدرے ملے جلے احساس کے ساتھ یہ تحریر پیش ہے۔ فخر اس امر کا کہ یہ کتابچہ جدید اردو تنقید کے ایک بہت بڑے نام کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور عجز اس بات کا کہ اس میں ابھی بہت سی کہنے کی باتیں رہ گئی ہیں۔

میں صدر نشین اکادمی محترم افتخار عارف اور نگران تدوین و طباعت محترمہ سعیدہ درانی کا ممنون ہوں، کیونکہ اس کتاب میں اگر کوئی حسن وافادیت ہے تو وہ انہی کے سبب سے ہے۔ عسکری کی ذاتی زندگی کی جو معلومات مجھے جناب محمد حسن مثنیٰ سے ملیں ان کا شکریہ مجھ پر الگ سے واجب تو ہے، مگر یہ ایک طویل داستان ہے جس کا کچھ احوال میں کسی اور جگہ لکھ چکا ہوں۔ کتاب میں شامل عسکری کا شجرہ انہوں نے بطور خاص میری درخواست پر بنایا ہے۔ علاوہ ازیں مسودے کے آخری پروف پر گہری نظر ڈال کر انہوں نے اسے ممکنہ حد تک غلطیوں سے محفوظ بھی کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تعارفی کتابچہ عسکری کے بارے میں اگر بہت کچھ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور بتائے گا۔

عزیز ابن الحسن

محمد حسن عسکری کا شجرہ نسب

محمد حسن عسکری۔حالات زندگی

یہ بات بہت کم معلوم ہے کہ محمد حسن عسکری کا تاریخی نام ''محمد اظہار الحق'' تھا۔مگر چونکہ یہ استعمال کم ہوا اس لیے بھائی بہنوں کو بھی ان کے انتقال کے بعد پتا چلا تھا۔البتہ ان کے چند ایک شاگردوں اور قریبی لوگوں کو یہ معلوم تھا۔گھر میں والدہ انہیں ''بھولے میاں'' کے نام سے پکارتی تھیں اور اپنی وفات تک (جو عسکری کے انتقال کے بعد ہوئی) انہیں اسی پیار کے نام سے پکارتی رہیں۔اپنی ماں کے ''بھولے میاں'' اور تاریخی نام محمد اظہار الحق کے حامل یہ صاحب دانش اور ادب وفن کے منفرد نقاد اردو دنیا میں محمد حسن عسکری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

وہ 5نومبر 1919 بمطابق 11 صفر 1338ھ کو ضلع میرٹھ (ہندوستان) کے ایک قصبے ''سراوہ'' میں پیدا ہوئے۔(1) عسکری کے دادا مولوی حسام الدین اپنے علاقے کی مشہور شخصیت تھے اور حدیث کے عالم تھے۔وہ ''پرتاب گڑھ'' میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے 1908 میں ریٹائر ہوئے اور 1926 میں ان کا انتقال ہوا۔ان کے کئی بیٹے تھے، جن میں سے ایک کا نام محمد معین الحق تھا۔محمد حسن عسکری انہی کے بیٹے تھے۔اور اپنے چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ان سے پہلے دو بھائیوں کا بہت چھوٹی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔دادا نے اپنے اس پوتے کی رسم ''بسم اللہ'' بڑی دھوم دھام سے کرائی تھی۔
عسکری کے والد نے پہلے ''بلند شہر'' (انڈیا) میں کوئی چھوٹی موٹی سرکاری اور پھر 29-1928 میں وہاں سے تیرہ میل دور ایک ہندو ریاست ''شکار پور'' میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کی تھی۔ان کی باقی عمر تقریباً وہیں اور میرٹھ میں گزری۔عسکری تعلیم کی خاطر اپنی جنم بھومی ''سراوے'' سے جو ایک دفعہ نکلے تو آبائی گھر سے ان کا تعلق تقریباً ختم ہی ہو گیا۔اس طرح ایم اے کرنے تک ان کی جائے رہائش شکار پور ہی رہی۔وہ ''بلند شہر''، ''میرٹھ'' اور ''الہ آباد'' میں بھی بغرض تعلیم مقیم رہے مگر سردی گرمی کی تعطیل میں اپنے والدین کے پاس ''شکار پور'' ہی آیا کرتے تھے۔36-1935 میں ریاست کے حالات خراب ہو گئے تو عسکری کا گھرانہ بھی مالی مشکلات کا شکار ہو گیا تھا۔

عسکری کی تعلیم کی ابتداء قرآن شریف اور اردو سے ہوئی تھی۔''سراوہ'' کے پرائمری اسکول میں بھی

تھوڑا بہت پڑھا مگر جلد ہی وہ شکار پور کے ایک مسلمان پرائمری اسکول میں داخل ہو گئے جو چٹائی والے عام اسکولوں کی طرح کا اسکول تھا۔ شکار پور میں انگریزی اسکول ایک ہی تھا: D.A. English School جس کے مالک کا نام آسارام تھا۔ پانچویں کلاس سے عسکری اس اسکول میں چلے گئے۔ رواج کے مطابق انہوں نے فارسی بھی پڑھنی شروع کر دی۔ ان کے فارسی اور اردو کے استاد کا نام مولوی مبارک حسین تھا۔ آٹھویں جماعت کے بعد 1934 میں انہوں نے مسلم ہائی اسکول "بلند شہر" میں داخلہ لے لیا اور 1936 میں میٹرک پاس کیا۔ 1938 میں میرٹھ کالج سے انٹرمیڈیٹ، 1940 میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے اور 1942 میں وہیں سے ایم اے انگریزی کی ڈگری لی۔

میرٹھ کالج میں عسکری دو سال تک رہے تھے۔ اس وقت پروفیسر کرار حسین بھی وہاں پڑھاتے تھے۔ دوسرے سیکشن میں ہونے کی وجہ سے عسکری ان سے پڑھ نہ سکے تھے مگر آخر عمر تک وہ انہیں استاد ہی سمجھتے رہے۔ بلند شہر، میرٹھ اور الہ آباد میں عسکری بغرض تعلیم مقیم تو رہے مگر ہاسٹل میں کبھی قیام نہ کیا۔ بلند شہر اور میرٹھ میں وہ اپنے تایا کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہے اور الہ آباد میں اپنے پھوپھی زاد بھائی پروفیسر نعیم الرحمن کے یہاں قیام کیا جو الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے اور جن کی ذاتی لائبریری ادب، تاریخ، نظم نثر، اردو، عربی، انگریزی بلکہ فرنچ اور جرمن کتابوں اور ڈکشنریوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ لائبریری عسکری کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔(2)

ادبی دنیا میں عسکری کا نام ایم اے کرنے سے پہلے ہی معروف ہو چکا تھا۔ ان کی پہلی دستیاب تحریر تو ایک ترجمہ "محبوبہ آموں را" ہے جو "ساقی" دہلی کے شمارہ نومبر 1939 میں چھپی تھی اور پہلا باقاعدہ افسانہ "کالج سے گھر تک" ہے جو "ادبی دنیا" میں اگست 1940 میں چھپا تھا۔ اس افسانے کا ذکر انہوں نے کرشن چندر، میراجی اور مختار زمن پر لکھتے ہوئے بھی کیا ہے۔(3) عسکری نے لکھا ہے کہ افسانہ لکھنے کی مشق تو انہوں نے پانچویں کلاس ہی میں شروع کر دی تھی اور ہر مروجہ اسلوب آزما دیکھا تھا۔ مگر 1939 میں "کالج سے گھر تک" انہوں نے کرشن چندر کے مشہور افسانے "دو فرلانگ لمبی سڑک" کے زیر اثر لکھا تھا۔(4)

اس وقت عسکری بی اے کے طالب علم تھے۔ اپنے دوست مختار زمن کے ساتھ مل کر "ادبی تجربے" کی خاطر لکھے گئے اس افسانے سے وہ نامطمئن اتنے نہیں تھے جتنے گھر والوں سے خائف، لہٰذا جب افسانہ چھپوانے کی باری آئی تو انہوں نے اسے فرضی نام سے چھپوانا چاہا مگر ادبی دنیا میں میراجی نے فرضی نام سے افسانہ چھاپنے سے کھرا سا انکار کر دیا تب انہوں نے اصلی نام ہی سے افسانہ چھاپنے پر آمادگی ظاہر کی۔ میراجی کی طرف سے اس افسانے کی پسندیدگی پر بی اے کے اس طالب علم کو اتنی خوشی ہوئی جو بی اے میں فرسٹ کلاس پا کر بھی نہ ہوئی تھی۔(5)

عسکری نے ایم اے انگریزی برصغیر کی اس یونیورسٹی سے کیا تھا جو اپنے شعبہ انگریزی کے اساتذہ کی وجہ سے پورے ہندوستان میں مشہور تھی۔ وہ یونیورسٹی کے اپنے استادوں، خصوصاً ستیش چندر دیب اور فراق گورکھپوری، کے اثرات کو آخر دم تک نہ بھلا سکے تھے، کیونکہ انہوں نے ان کے اندر سے مغربی ادب کی ہیبت ختم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ (6) اس یونیورسٹی کا انتخاب عسکری کا اپنا نہ تھا بلکہ بقول حسن مثنیٰ ان کے پھوپھی زاد بھائی نعیم الرحمٰن نے انہیں الہ آباد بلوایا تھا جو اسی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے چند باتیں عسکری کے گھر کے ماحول، ابتدائی تربیت اور مشاغل، ان کی دلچسپیوں اور بھائی بہنوں سے ان کے تعلق کے بارے میں کہنا باعث معلومات ہوگا۔ عسکری اردو کے ایک ایسے لکھنے والے تھے جنہوں نے بلا مبالغہ ہزارہا صفحات لکھے ہوں گے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ان کی تحریروں اور نجی خطوط میں بھی اپنی ابتدائی گھریلو زندگی اور اہل خانہ سے تعلق کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں ملتی۔ اس باب میں ہمیں ان کے بھائی حسن مثنیٰ سے جو معلومات ملیں ہم انہی سے استفادہ کریں گے۔

عسکری کا گھریلو ماحول اس زمانے کے عام گھروں کی طرح اتنا ہی مذہبی تھا جتنا کہ عموماً ہوا کرتا ہے۔ صبح اٹھتے ہی اماں ابا اور تایا تائی نماز پڑھتے۔ صبح سویرے والد کی زبان پر اکثر قرآن پاک کی آیتیں ہوتیں یا یہ مشہور شعر

بادشاہا جرم مارا درگزار   ما گنہگاریم وتو آمرزگار

تائی اماں بچوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر میں دیوان حافظ اور گلستان و بوستان بھی رکھے رہتے۔ گھر میں رسالے باقاعدگی سے آتے اور "دارالاشاعت" پنجاب کی کتابیں بھی۔ رسالوں میں "عالمگیر"، "نیرنگ خیال"، "انکشاف" اور بچوں کا اخبار "پھول" بڑے شوق سے پڑھے جاتے۔ غلام عباس کی کتاب *الحمرا کے افسانے* عسکری اور ان کے سب بہن بھائیوں کی مقبول ترین کتاب تھی۔ گھر کے ہر فرد نے اسے کئی کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ عسکری کو فرسٹ ایڈ ہی سے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔

بچپن میں وہ ضدی نہیں تھے اور نہ ہی والدین سے بہت زیادہ فرمائشیں کرتے مگر ایک دفعہ انہیں ایک بڑے مزے کی حرکت پر بچپن میں سزا ملی تھی: اس زمانے میں روپے کی اچھی قدر تھی۔ روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے اور ایک پیسے سے بہت سے کام نکلتے تھے۔ ایک روز گھر کے دروازے پر کسی فقیر نے آواز لگائی تو عسکری بھاگ کر اسے پانچ روپے دے آئے۔ اس زمانے میں چپڑاسی کی تنخواہ دس روپے تھی۔ والد کو بیٹے کی اس "فیاضی" کا پتہ چلا تو اس حرکت پر انہیں سزا دی گئی جس کا چرچا خاندان میں مدتوں رہا۔

گھر میں والد کا رعب و دبدبہ تھا۔ مگر ماں سے بچوں کا تعلق پیار دلار کا تھا۔ عسکری اپنے والدین کے سب سے بڑے بچے تھے۔ ان سے چھوٹی ایک بہن تھی جس سے عسکری کو بہت لگاؤ تھا۔ ان سے چھ برس چھوٹے دوسرے بھائی محمد حسن مثنیٰ تھے۔ گرمی کی چھٹیوں میں جب عسکری میرٹھ کالج سے گھر لوٹتے تو بہن بھائیوں کے لیے تفریح کا اچھا خاصا موقع نکل آتا۔ وہ انہیں وہاں کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتے۔ مشاعروں کی روداد سناتے اور شاعروں کا کلام ان کی نقل کے ساتھ باآواز بلند پڑھتے۔ میرٹھ میں مشہور شاعر ساغر نظامی اور پھر الہ آباد کے زمانے سے فراق گورکھپوری کے اشعار انہی کے اسٹائل میں سنانا عسکری کا خاص مشغلہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ سے لیکر بی اے کے زمانے تک ان پر سوشلزم اور کمیونزم کا بھی جوش رہا اور خدا کے وجود سے انکار بلکہ اس انکار سے پورا لطف لیتے رہے۔

1941ء کی اپنی ایک تحریر (جس پر مقالات محمد حسن عسکری میں "ایک نفسیاتی مطالعہ" کا عنوان ہے) میں انہوں نے اس زمانے کی داخلی کیفیات، قنوطیت، منفیت اور روحانی کھوکھلے پن کی بڑی تفصیلی داستان بھی لکھی تھی۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں ان کے دل و دماغ میں اٹھنے والے یہ بگولے تا دیر نہیں رہے۔ اپنے پہلے افسانوی مجموعے "جزیرے" کے اختتامیہ '1943' میں وہ انکار و منفیت کی بجائے زندگی کی اثباتی قدروں پر زور دینے لگے تھے۔ لیکن، بہ روایت حسن مثنیٰ، انٹرمیڈیٹ کے ایک طالب علم کا اپنی ڈائری پر یہ جملہ لکھنا کہ "میں ایک پرکتا بورژوا ہوں" عسکری کی ابتدائی ذہنی ساخت کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے کیٹس کی ایک سانیٹ کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا:

Bright star, would I were steadfast as thou art

"چمک دار تارے تری طرح میں بھی فلک کی فضاؤں میں قائم جو ہوتا" ۔ یہ شاید ان کا قدیم ترین ترجمہ تھا جو انہوں نے محفوظ نہ رکھا۔

بہر حال جزیرے کے اختتامیہ 1943 میں وہ انکار و منفیت کی بجائے زندگی کی اثباتی قدروں پر زور دینے لگے تھے۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد انکے پھوپھی زاد بھائی نعیم الرحمٰن نے انہیں الہ آباد بلوا لیا جہاں وہ مختار زمن کی سائیکل پر بیٹھ کر یونیورسٹی میں داخلہ فیس بھرنے گئے۔ مختار زمن نے اس ملاقات کا حال یوں لکھا ہے:

> "ایک دن میں ۷ ایلی روڈ پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحب دبلے پتلے ململ کا باریک کرتا اور ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ پہنے پروفیسر موصوف کے پاس خاموش بیٹھے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے فرمایا: 'لو بھئی ان سے ملو یہ میرے کزن محمد حسن عسکری ہیں، یونیورسٹی میں داخلہ لینے آئے ہیں' عسکری صاحب نے اپنی

> پتلی انگلیوں والا قدرے نازک سا ہاتھ ملایا اور گلے سے شاید 'غوں' سے ملتی جلتی آواز نکالی جس کا مطلب غالباً 'السلام علیکم' تھا۔ اسی دن سے ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی۔ زمان و مکان کے فاصلے اس دوستی پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکے۔"

(مختار زمن، "۲ ایبلی روڈ"، مشمولہ "تخلیقی ادب"، شمارہ ۳، ص ۱۸)

نعیم الرحمن کا گھر عسکری کی ابتدائی تربیت گاہ تھا مگر لگتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی عربی، فارسی دانی سے زیادہ ان کی لائبریری عسکری کے لیے کشش کا باعث تھی جہاں وہ گرمی کی دوپہروں میں کتابیں پڑھتے اور شیکسپئر کے کرداروں سے خوابوں میں ملاقاتیں کرتے۔ رحمان خاندان کا یہ گھر ایں خانہ ہمہ آفتاب است کا مصداق تھا جہاں انکی تین نسلیں پڑھنے لکھنے میں مصروف نظر آتیں۔ اس زمانے (بی اے) میں اردو ادب سے عسکری کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ انگریزی اور فلسفہ و سیاسیات سے خاص رغبت تھی۔ یہیں پر مختار زمن کے ذریعے عسکری کو معلوم ہوا کہ اردو میں "نیا ادب" نامی ایک شے پیدا ہوئی ہے۔ (7) اور انہوں نے مذاق ہی مذاق میں "نئے ادب" کی نقل کرتے ہوئے اپنا پہلا افسانہ لکھ ڈالا اور پھر بعد میں کرشن چندر کی کتاب "نظارے" پر ایک انگریزی تبصرہ لکھ کر اپنی یونیورسٹی کے رسالے میں چھپوا دیا (یہ عسکری کی پہلی یا دوسری تحریر تھی، مگر یہ دستیاب نہیں)۔

عسکری کے بہت سے ابتدائی مشاغل کہیں نہ کہیں ضرور مذکور ہوئے ہیں مگر میرٹھ کالج، یونیورسٹی اور کچھ بعد تک کے زمانے میں ان کا ایک اہم شوق فلم بینی اور فلم تنقید کا بھی تھا، جس پر ان کے بھائی حسن مثنیٰ نے بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ میرٹھ ایک بڑی چھاؤنی تھی جہاں اس وقت کے لحاظ سے اچھے اچھے سینما گھر تھے جن میں نئی نئی انگریزی فلمیں لگتیں۔ عسکری بڑے شوق سے یہ فلمیں دیکھتے۔ چھٹیوں میں گھر آتے تو فلموں کے مکالمے ایکٹنگ کے ساتھ بہن بھائیوں کے سامنے دہراتے۔ شیکسپئر کے ڈراموں پر مبنی اور چارلی چیپلن کی فلمیں مثنیٰ صاحب کو بھی دکھاتے۔ فلموں اور اداکاروں کی درجہ بندی کرتے اور اداکاراؤں کی تصویروں کا البم بناتے۔ اس دور کی مشہور اداکاراؤں "جنجر راجرز" اور "لوریٹا ینگ" کی دو بڑے سائز کی رنگین تصویریں انہوں نے بطور خاص اپنے ذاتی ذخیرے میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ 1936ء میں بننے والی مشہور فلم رومیو جولیٹ میں جولیٹ کا کردار ادا کرنے والی اداکارہ نارما شیئرر کو بھی وہ بہت اونچا مقام دیتے تھے۔

فلم آرٹ اور فلم تنقید پر بھی انہوں نے کتابیں جمع کر رکھیں تھیں اور معروف روسی فلم ساز آئزن اشٹین ان کے پسندیدہ فلم ڈائریکٹر تھے۔ فلم آرٹ پر ان کی تحریریں نشان زد کر کے پڑھتے تھے۔ فلموں کا یہ شوق انہیں انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں لگا تھا اور قیام پاکستان کے بعد تک رہا۔ مثنیٰ صاحب بتاتے ہیں: فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ شروع شروع میں عسکری کو اداکاری کا بھی کچھ لپکا تھا۔ بہن بھائیوں کو سامنے بٹھا

لیتے۔کبھی کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر جولیس سیزر میں سے تقریر نکال کر پڑھتے۔مشہور برطانوی مقرر ایڈمنڈ برک کی تقریروں کے وہ خاص عاشق تھے اور کتاب کھول کر کہتے'' آؤ میں تمہیں برک کی تقریر سناؤں''۔میرٹھ، الہ آباد اور دہلی کے زمانے تک وہ انگلش فلمیں زیادہ دیکھتے تھے۔ہندوستانی فلموں میں دیوکا رانی کی فلم ''اچھوت کنیا'' انہیں پسند تھی اور مشہور ڈانسر اودے شنکر سے بھی بہت دلچسپی تھی۔البتہ لاہور آنے کے بعد وہ ہندوستانی اردو فلمیں زیادہ شوق سے دیکھنے لگے تھے۔

ان کے پرانے ساتھی انتظار حسین نے تو عسکری کے اس شوق پر لکھا بھی ہے۔اور ان کی پسندیدہ ہیروئنوں (نور جہاں اور فلم سینڈورکی ہیروئن شیمم) کے نام بھی لکھے ہیں۔ثمیٰ صاحب کی روایت کے مطابق مشہور صحافی اقبال صدیقی کا تو یہ کہنا تھا: میرٹھ میں انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں مجھے انگریزی فلمیں دیکھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا عسکری نے سکھایا تھا۔گورنمنٹ کالج، لاہور میں صفدر میر نے ایک فلم سوسائٹی بنائی تھی جس میں روسی فلموں کا عمدہ انتخاب تھا۔یہاں بھی عسکری نے صفدر کے ساتھ مل کر فلمیں دیکھی تھیں۔فلموں کا یہ ذوق وشوق دراصل فکشن سے عسکری کی رغبت کا حصہ تھا۔اور یہ شوق صرف فلم دیکھنے کی حد تک ہی نہ تھا بلکہ ایکٹنگ کے آرٹ اور خاص طور پر فلم کے فن سے بھی ان کی خصوصی رغبت تھی۔اس کا اظہار ان کے بعد کے چند ایک مضامین خصوصاً ''فلم میں رنگ۔مگر کیوں اور کس لیے''، (8) سے بھی ہوتا ہے۔

ایم اے کے فوراً بعد عسکری غم روزگار کے چکر میں آ گئے۔اس وقت تک '' شکارپور'' ریاست کے زوال کی وجہ سے ان کے والد کے حالات بھی اچھے نہیں رہے تھے۔ان پر گھر سے کوئی دباؤ تو نہیں تھا مگر بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے وہ خود اپنی ذمہ داری سمجھ کر اس پہلو کو محسوس کرنے لگے تھے۔اس مقصد کی خاطر انہوں نے دہلی کی راہ لی۔ 44-1943ء ، جنگ کا زمانہ تھا۔کچھ عرصے کے لیے محکمہ فوجی اطلاعات دہلی میں ملازمت کی، دہلی ریڈیو سٹیشن پر سکرپٹ رائیٹر کے طور پر کام کیا۔مگر کسی چھوٹی سی بات پر ناراض ہوکر وہاں سے چلے آئے۔ہندوستان میں انہوں نے دومرتبہ کالج میں بھی پڑھایا۔پہلے چند ماہ کے لیے، عربک کالج، دہلی (موجودہ نام ذاکر حسین کالج) میں اور پھر میرٹھ کالج میں۔(9)

وہ دہلی میں رہنے کو ہر شہر پر ترجیح دیتے تھے اور اس کے لیے بڑی تگ ودو بھی کی۔دسمبر 1946ء میں وہ میرٹھ کالج میں چلے آئے۔یہ اگرچہ ان کا اپنا کالج تھا مگر چھوٹے کالج اور چھوٹے شہر کے ماحول سے وہ خوش نہ تھے۔یہاں بھی ان کا قیام عارضی رہا۔اس دوران انہوں نے اسلامیہ کالج، لاہور کے لیے بھی کوشش کی۔'' ڈان'' اخبار، دہلی میں انٹرویو دیا۔رام پور اور اعظم گڑھ کے کالجوں کے لیے بھی کوشش کی۔ چھوٹے شہر کے کالجوں سے وہ اس لیے بھاگتے تھے کہ وہاں خواہ مخواہ '' بزرگ بننا'' پڑتا تھا۔جس طرح کے افسانے وہ اس زمانے میں لکھا کرتے تھے وہ استادی کے ساتھ چل نہیں سکتے تھے۔(10) عسکری

جب میرٹھ کالج میں پڑھانے کے لیے گئے اس وقت انکی عمر 25 برس تھی۔ "ساقی" دہلی میں اپنے معروف کالم "جھلکیاں" کی وجہ سے اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت پوری ادبی دنیا میں تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اُن دنوں اُسی کالج میں تھرڈ ایئر کے طالبعلم تھے۔ انتظار حسین ایم اے کے آخری سال میں اور سلیم احمد ایف اے میں تھے۔ احمد ہمدانی بھی اس کالج کے طالبعلم تھے اور وہیں عسکری کے بھائی حسن مثنیٰ بھی سال چہارم میں تھے۔ پروفیسر کرار حسین، شوکت سبزواری اور غیور احمد رزمی اساتذہ کی صف میں شامل تھے۔ جالبی صاحب نے اپنے ایک مضمون مشمولہ عسکری کے افسانے میں اس زمانے کے عسکری کا ایک نقشہ بھی کھینچا ہے۔ تقریباً اسی زمانے کے حالات اور صورتِ حال پر انتظار حسین نے بھی اپنی کتاب چراغوں کا دھواں میں تفصیل سے لکھا ہے۔ عسکری پر لکھنے والے تقریباً ہر ادیب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ ابتداء ہی سے بہت کم گو تھے اور مخاطب سے بے تکلف ہونے میں انہیں بہت وقت لگتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس زمانے کے معروف لوگوں سے ان کی راہ و رسم رہی اور ان کی محفلوں میں شریک رہے۔ سب کی سنتے، مسکراتے رہتے مگر بولتے کم تھے۔

ان کے قیامِ دہلی کے دور کی کچھ یادیں جمیل الدین عالی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھی ہیں۔ (11) خود عسکری نے اپنے ابتدائی خطوط اور غلام عباس اور میرا جی کے خاکے میں دہلی کے زمانہ قیام کی بہت سی باتیں لکھی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر انہیں بہت پسند تھا اور وہاں جمے رہنے کی انہوں نے بہت کوششیں کی تھیں۔ دہلی کی زندگی اور اردو زبان و کلچر سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ مگر ادبی طرزِ احساس میں وہ پنجابی ادیبوں سے زیادہ قرب محسوس کرتے اور انہیں یوپی والوں پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ 1945-46ء کا دور تھا۔ تحریک پاکستان اور برصغیر کے مسلمانوں کا قومی کلچر عسکری کی خاص دلچسپی بنے ہوئے تھے۔ اس پر آشوب دور میں وہ مسلمان عوام، مسلم اور اردو تہذیب کو ہندوستان میں اجنبی ہونے سے بچانے کے لیے میرٹھ میں ایک عظیم الشان مسلم کلچرل کانفرنس منعقد کرانے کی فکر میں تھے۔ اور غلام عباس کے ساتھ مل کر مسلم کلچر کے بارے میں ایک رسالہ یا کتاب نکالنا چاہتے تھے۔ (12)

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب، معاشرت، کلچر اور ادب سے چونکہ انہیں خصوصی دلچسپی تھی اور وہ اسے ہندو اکثریت کی چیرہ دستیوں سے الگ ممتاز اور محفوظ رکھنا بہت ضروری سمجھتے تھے اسلئے پاکستان کا قیام ہی ان کے نزدیک برصغیر کے مسلم شعور اور کلچر کے تحفظ کی ضمانت تھا۔ نتیجتاً ان کی اس زمانے کی سیاست بھی مسلم لیگ کے گرد گھومتی تھی۔ اس دوران ان کی دلچسپی خاکسار تحریک سے بچھڑے ہوئے کچھ لوگوں کے ایک اخبار "الامین" سے ہوگئی جن میں اہم نام پروفیسر کرار حسین کا تھا۔ اس اخبار میں انہوں نے سیاسی مضامین بھی لکھے مگر ان میں ان کا زور مسلمانوں کے معاشی مسائل کی

طرف رہا جو ان کی "اشتراکیت پسندی" کا غماز تھا۔

قیام پاکستان سے قبل اور کچھ عرصہ بعد تک عسکری کا کوئی مستقل روزگار نہ تھا۔ ایک دو کالجوں میں مختصر عرصے کے لیے پڑھانے کے علاوہ ان کے گذر اوقات کا بڑا ذریعہ تراجم تھے۔ یہ ان کی افسانہ نگاری کا آخری دور تھا جس کا آغاز 40-1939ء میں ہوا تھا۔ ان کے افسانے اور تنقید کا تعلق ان کے معاشی مسائل سے نہ تھا۔ لیکن تراجم کا مسئلہ مختلف تھا۔ ان کے بعد کے تراجم اور ترجمے کے مسائل کے بارے میں ان کی تحریروں سے یہ امر پوری طرح عیاں ہے کہ ان کے تراجم بھی اردو نثر اور اس کے اسالیب کے حوالے ان کے پختہ تنقیدی شعور کے زائیدہ تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے ابتدائی تراجم کا آغاز معاشی ضرورت سے ہوا تھا۔ ان کا پہلا ترجمہ ریاست اور انقلاب از لینن اور دوسرا ترجمہ میں ادیب کیسے بنا از گورکی صرف معاشی ضرورت کے تحت کئے گئے تھے اور کم از کم آخرالذکر کے مافیہ سے عسکری کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔(13) بعد کے تراجم مثلاً "مادام بوواری" وغیرہ کو انہوں نے ان کی فنی خوبیوں کی بناء پر ترجمہ کیا تھا مگر معاشی ضرورت ان میں بھی کارفرما تھی۔ قیام پاکستان سے قبل ہی ان کا مکتبہ جدید، لاہور سے تعلق قائم ہو چکا تھا۔ جو ان کے تراجم کا معاوضہ فوراً ادا کر دیتا تھا۔

مسلم کلچر اور تحریک پاکستان سے عسکری کی دلچسپی اتنا اہم مسئلہ ہے کہ ایک باب کا متقاضی ہے۔ اور ہم آئندہ بھی اس پر اشارے کریں گے مگر یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ 48-1947ء میں نظریہ پاکستان سے شدید قلبی و ذہنی مناسبت، ترقی پسند نظریہ ادب سے سخت اختلاف رکھنے اور نظریاتی و ادبی میدان میں زبردست قلمی معرکہ آرائیاں کرنے کے باوجود ابتداً عسکری کا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ جولائی 1947ء تک بھی نہیں تھا۔ وہ ہندوستان میں رہ کر ہندو فسطائیت اور کمیونسٹوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔(14) مگر چونکہ 1947ء میں ان کے والد کا میرٹھ میں انتقال ہو گیا تھا (جن کی شدید علالت کا ذکر 10 مئی 1947ء کے ایک خط بنام آفتاب احمد میں ہے) اور عسکری اپنے خاندان کے اکیلے سرپرست رہ گئے تھے اور پھر وہاں کوئی مستقل روزگار نہ ہونے اور تراجم کے سلسلے میں مکتبہ جدید، لاہور سے تعلق ہونے، یا نہ جانے کس سبب سے کسی لمحے انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اکتوبر 1947ء میں وہ پہلے پہل اکیلے ہی پاکستان آئے تھے۔ بعد میں نومبر 1947ء میں ان کے دیگر اہل خانہ بھی پاکستان آ گئے۔ انہوں نے دیگر بہت سے ادیبوں کی طرح اول اول لاہور ہی میں قیام کیا تھا اور پھر فروری 1950ء میں "ماہِ نو" کے ایڈیٹر ہو کر باقی کے 30 برس کے لیے کراچی کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا لیا۔

عسکری کو اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں شکار پور (انڈیا)، بلند شہر، میرٹھ، الہ آباد، دہلی، لاہور اور کراچی میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کی زیادہ عمر تو شکار پور اور کراچی میں گذری تھی۔ لیکن یوں نظر آتا

ہے کہ ان پر زیادہ اثرات الہ آباد، دہلی اور لاہور کے رہے جہاں وہ مستقل طور پر زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکے۔ مگر ان کی ذہنی زندگی اور ادبی نشوونما میں ان شہروں، وہاں کے ماحول، ادبی فضا اور کلچری سرگرمیوں کے نقوش بڑے گہرے اور دیرپا تھے۔ الہ آباد اور وہاں کی یونیورسٹی نے ان کی تعلیمی پرداخت کی، دہلی کی کلچری زندگی نے ان کی نثری زبان اور اسلوب بیان کو سنوارا اور لاہور کی نئی ادبی تحریک نے ان کی ادبی حسیت کو مہمیز کیا تھا۔

بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ لاہور کو عسکری نے اپنی معاشی ضرورت کے لیے منتخب کیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ لاہور سے عسکری کا تعلق اصلاً ادبی حوالوں سے تھا۔ اسی لیے ان کے روابط پاکستانی علاقوں میں لاہور ہی کے ادیبوں سے تھے، جو آزاد اور حالی کی نئی نظم کی تحریک کے بعد "نئے ادب" کی دوسری بڑی تحریک کا ہراول دستہ تھے۔ مثلاً میرا جی، قیوم نظر، یوسف ظفر، غلام عباس، ڈاکٹر تاثیر، احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر آفتاب احمد۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ ان کی ملاقات پہلے پہل دہلی میں ہوئی مگر ان کا تعلق لاہور گروپ ہی کے ساتھ تھا۔ لہٰذا لاہور سے عسکری کی وابستگی کسی سیاسی و معاشی حوالے کے بجائے ادبی وتمدنی نوعیت کی تھی۔ یوپی کی بہ نسبت یہاں کے ادیبوں سے ان کا تعلق گہرا تھا لہٰذا گلے شکوے بھی انہی سے زیادہ ہوئے۔

لاہور آنے کے بعد عسکری کا قیام کرشن نگر میں اپنے ایک چچازاد بھائی ارشد کے ہاں رہا جو ڈاکخانے کے ملازم تھے اور ان سے قبل لاہور آچکے تھے۔ (15) اس گھر میں عسکری کے علاوہ ان کی والدہ ایک بہن اور تین چھوٹے بھائی بھی رہتے تھے جن میں سے حسن مثنیٰ ایم اے کے آخری سال میں تھے اور انہوں نے فائنل امتحان پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے دیا تھا۔ پاکستان سے عسکری کا تعلق کسی طرح بھی مالی یا مادی منفعت کا نہیں تھا، جیسا کہ ان کے اس زمانے کے خطوط بنام آفتاب احمد سے ظاہر ہے، محض نظریاتی اور تہذیبی اقدار کی پاسبانی کے ایک وسیلے کے طور پر تھا۔ ان کی لاہور کی ابتدائی زندگی اس امر پر شاہد ہے کہ ہر طرح کی مالی مشکلات اور ذاتی سطح پر بے پناہ علمی و ذہنی صلاحیتوں اور کچھ تعلق داریوں کے باوجود یہاں انہوں نے اپنے لیے نہ تو کوئی مکان یا پلاٹ الاٹ کرایا اور نہ ہی شروع میں نوکری حاصل کرنے پر توجہ دی۔ یاد رہے کہ پاکستان آنے تک عسکری کے نام کا ڈنکا افسانہ نگار اور ایک منفرد، متعین نقطہ نظر کے حامل نقاد کے طور پر پوری ادبی دنیا میں بج چکا تھا اور گردوپیش کے لوگوں میں وہ انتہائی عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لاہور میں عسکری کے ذاتی دوستوں میں سے ڈاکٹر آفتاب احمد کا انہیں بڑا سہارا تھا۔ انہوں نے چاہا بھی کہ عسکری یہاں کے کسی کالج میں لیکچرر ہو جائیں کیونکہ ان کے لیے بڑی آسانی سے جگہ نکل سکتی تھی مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

نئے ملک اور فضا میں عسکری آزادی کے اس تجربے کو ہر طرح سے محسوس کرنا چاہتے تھے جس کے لیے

پاکستان ان کا آدرش تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے جو تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے، نہ تو کوئی رہائشی و تجارتی زمین حاصل کی اور نہ ہی کوئی مستقل ذریعہ روزگار اختیار کیا۔ بس ادب کے سوائی رزق پر گزارا تھا۔ گزر بسر کا ذریعہ تراجم اور ریڈیائی تقریریں تھیں۔ ترجمے کا جو کام انہوں نے تقسیم سے قبل ہی شروع کر دیا تھا، یہاں بھی اسے جاری رکھا اور آغاز فلوبیر کے ناول مادام بوواری سے کیا جسے ترجمہ کرنے کی خواہش کا اظہار 4 فروری 1947ء کے خط بنام آفتاب احمد میں ہے۔ ترجمہ اس طرح کرتے کہ ناول سامنے رکھ کر بولتے جاتے اور ان کے بھائی حسن مثنیٰ، جو لاہور سے ایم اے کا امتحان دینے والے تھے، لکھتے جاتے۔ مکتبہ جدید والوں کی شرافت تھی کہ جتنے صفحے ترجمہ ہو جاتے ان کی فوراً ادائیگی کر دیتے۔ اس طرح گھر کا گزارا چلتا۔

شاہد احمد دہلوی کے رسالے "ساقی" سے عسکری کا تعلق 1939ء سے تھا۔ وہ اس کی ادارت میں بھی شریک تھے۔ فراق گورکھپوری کے مستقل سلسلے "باتیں" کے بعد عسکری نے اس میں "جھلکیاں" کا ماہانہ کالم شروع کر دیا تھا۔ یہ عسکری کی شروعاتی تنقیدی تحریریں تھیں جو اپنی بے ساختگی، شگفتہ مزاجی، سنجیدہ ادبی نقطہ نظر، بدنام زمانہ "فن برائے فن" کی حمایت اور ترقی پسند نظریہ ادب سے اختلاف کی ایک موثر ترین آواز ہونے کی وجہ سے ادبی دنیا میں ایک ہلچل مچائے ہوئے تھیں۔ اس وقت کا نیا ادبی شعور اور ترقی پسند تحریک بحیثیت مجموعی تحریک پاکستان کی مسلم لیگی سیاست کو فرقہ پرستی قرار دے کر بظاہر غیر جانبداری کا تاثر دیتے تھے اور اپنے تئیں چند خاص انسانی آدرشوں، معاشی انصاف، سماجی تبدیلی اور ہمہ گیر انقلاب کے خواہاں تھے اور ادب کو اس تبدیلی کا ایک آلہ مانتے تھے۔ اس کے مقابلے میں عسکری ایک طرف تو ادب اور زندگی کے مستقل تخلیقی تعلق اور ادب و فن کے ادبی و فنی معیاروں کی برتری کے داعی تھے اور دوسری طرف برصغیر کے امتیازی مسلم شعور اور کلچر کو پائیدار حصار مہیا کرنے کے لیے مسلمانوں کے الگ وطن کے تصور کے زبردست موید تھے۔ وہ ترقی پسندوں کے محدود سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے بجائے مجموعی طور پر کل زندگی اور خصوصی طور پر مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب اور کلچری اوضاع سمیت تمام فکری، ذہنی و عملی اعمال کو ادبی طرزِ احساس کا حصہ بنانے پر زور دیتے تھے۔ اس نظری اختلاف کی بنا پر عسکری کے اور برصغیر کے عمومی ادیبوں اور خاص طور پر ترقی پسندوں کے نقطہ نظر میں زبردست ٹکراؤ اور محاربہ تھا، جس کا آغاز تو قیامِ پاکستان سے قبل ہی ہو چکا تھا مگر جس میں معرکے کی شدت پاکستان بننے کے بعد آئی تھی۔

لاہور آنے کے کچھ عرصہ بعد تک عسکری کا قلم خاموش رہا، کیونکہ فسادات اور ہجرت کے آشوب کی وجہ سے "ساقی" کی اشاعت معطل ہو چکی تھی اور برصغیر کے دوسرے ادبی رسالوں پر عموماً ترقی پسندوں کا غلبہ تھا۔ اور پھر پاکستان بن چکنے کی وجہ سے کوئی ایسا فوری ادبی چیلنج بھی موجود نہیں تھا۔ لہٰذا عسکری کی قلمی

زندگی میں ایک مختصر سا وقفہ ماندگی تھا۔ صبح دو تین گھنٹے مادام بواری کے ترجمے پر لگاتے اور اپنے میرٹھ کے زمانے کے دوست انتظار حسین کو ساتھ لیتے جو ان دنوں عسکری ہی کے گھر میں ان کے اہل خانہ کے ساتھ قیام پذیر تھے، اور لاہور کی سڑکیں ماپنے نکل کھڑے ہوتے۔ کرشن نگر سے گورنمنٹ کالج جاتے جہاں ان کے دوست آفتاب احمد لیکچرر تھے۔ وہاں ان کی دوستی معروف نفسیات داں ڈاکٹر اجمل سے ہو چکی تھی۔ وہاں سے مکتبہ جدید کا چکر لگتا اور پھر ریڈیو اسٹیشن غلام عباس کے پاس چلے جاتے۔ شاہد احمد دہلوی، حکیم حبیب اشعر اور حکیم اجمل خان کی آل اولاد میں سے بہت سے لوگ بھی ان دنوں لاہور میں تھے۔ عسکری اور انتظار حسین کی شام کی مجلس ان لوگوں کے ساتھ ہوتی۔ ان دنوں عسکری کی کم آمیزی ان مجلس آرائیوں میں حارج نہ تھی۔ چائے خانوں میں بیٹھنا بھی انہیں اچھا لگتا تھا۔ ان کا ایک ہمیشہ کا شوق پیدل چلنا تھا۔ میرٹھ میں انتظار حسین، دہلی میں غلام عباس اور لاہور میں انتظار حسین، آفتاب احمد اور کبھی کبھی گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک ذہین وفطین طالب علم مظفر علی سید بغل میں کتاب دبائے ان کے ساتھ ہو لیتے۔ بقول انتظار حسین عسکری ان دنوں زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ مال روڈ، میکلوڈ روڈ اور باغ جناح میں گھومنا پھرنا اور شام کو کسی ہوٹل یا ریستوران میں بسر جانا ان کا وطیرہ تھا۔ وہ کھلی فضا اور ماحول کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ تنگ جگہ انہیں گھٹن ہوتی تھی۔ ان دنوں لاہور کے ہوٹل ابھی ائر کنڈیشنڈ نہیں ہوتے تھے، اس لیے کرشن نگر بازار کے کڑی چائے والے کھوکھوں سے لے کر کیفے اورینٹ تک کہیں بھی بیٹھ سکتے تھے۔ (16)

یوں عسکری کی قلمی معرکوں کی عادی طبیعت خاموشیوں کے مزے لے رہی تھی کہ ہندوستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور عسکری نے پھر سے "برش قلم" سنبھال لیا۔ دسمبر 47 میں چند ہندوستانی ادیبوں نے حکومت ہند کی کشمیر پالیسی کی حمایت میں ایک بیان جاری کیا تھا۔ عسکری اور غلام عباس کا خیال تھا کہ پاکستانی ادیبوں کو بھی اپنی حکومت کے موقف کے حق میں بیان دینا چاہیے۔ یہ بیان جنوری 1948ء کے پاکستان ٹائمز میں چھپا تھا جس پر سوائے فیض کے سب ترقی پسندوں نے دستخط کرنے سے انکار کیا تھا۔ (17) عسکری جو پہلے ہی ترقی پسند ادب وسیاست سے اختلاف رکھتے تھے، اس موقعہ پر ان کی کشمیر مخالف پالیسی کی وجہ سے کیمونسٹ نقطہ نظر کے خلاف پھر سے ڈٹ گئے اور انتظار حسین کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ "نظام" کے لیے انہوں نے "پاکستان اور سیاسی جماعتیں" (مئی 1948ء) اور "ادیب اور ریاست سے وفاداری کا مسئلہ" (جولائی 1948ء) (18) کے عنوان سے جو مضامین لکھے ان پر ہمیشہ کی طرح ایک ہنگامہ بچ گیا۔ ماہنامہ "ساقی" جب کراچی سے نکلنا شروع ہوا تو عسکری نے اپنا مستقل کالم جھلکیاں پھر سے شروع کر دیا۔ ادیب اور ریاست سے وفاداری اور مسلم تشخص و اردو زبان کے مسائل پر یہاں بھی لکھنے لگے۔ اس زمانے میں ان کے موضوعات زیادہ تر مسلم

کلچر، پاکستانی کلچر اور ادیب اور پاکستان کو درپیش مسائل رہے ہیں۔ مگر اسی عرصے میں انہوں نے اپنا معروف مضمون "انسان اور آدمی" اور اسی نام کے مجموعے کے بعض دیگر مضامین بھی لکھے جن کی نوعیت محض ہنگامی نہیں تھی۔ اردو ادیبوں سے انہیں شکایت یہ تھی کہ مسلمانوں کا یہ ذہنی وفکری کام کرنے والا طبقہ اپنی قوم کی امنگوں اور ملی کلچر سے اتنا بے تعلق کیوں ہے۔

اس زمانے میں عسکری کا تصور پاکستان ایک عوامی اشتراکی ریاست کی قسم کا تھا، جس میں مسلمانوں کے تہذیبی شعور کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی ومعاشی مسائل، اسلامی معاشیات اور انصاف کے تقاضوں کے تحت حل ہونے تھے۔ ان کے نزدیک پاکستان کو انسانی آزادی اور روحانی کشادگی کا ایک ایسا ماحول بننا تھا جس میں عوام ہر قسم کی اجارہ داری اور معاشی جبر وخوف سے آزاد ہو کر اپنے ذہنی شعور اور عمل کی زندگی گزار سکیں۔ ان کا تصور پاکستان روس کے جبری اشتراکی معاشرے کا نہ تھا بلکہ کچھ یورپی فرانسیسی انداز کی اشتراکیت کا تھا جس میں سماجی معاشی انصاف بھی ہو، تہذیبی وکلچری اوضاع کی امانت داری بھی ہو اور جس میں ملک وقوم کے عام افراد اور بالخصوص علم ودانش کے حامل ادیب وشاعر اپنی ریاست اور سماجی اقدار کے وفادار رہتے ہوئے حکومتی وسرکاری اثر ورسوخ سے آزاد ہو کر ایک باخبر ناقد کے فرائض سرانجام دیتے رہیں۔ (19)

پاکستان میں عسکری کے ان آدرشوں کا ٹکراؤ سب سے پہلے ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامل کمیونسٹوں سے ہوا اور بعد میں اپنی ہی حکومت کی پالیسیوں سے اس وقت ہوا جب انہیں ترقی پسندوں کے حق آزادیٔ اظہار کی خاطر اہل اقتدار سے لڑنا پڑا۔ پاکستانی کلچر، اردو کے قومی زبان ہونے اور کشمیر کے مسئلے پر ان کا ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں سے کھلا اختلاف تھا مگر وہ ان سے ادبی وذہنی سطح پر نپٹنا چاہتے تھے، حکومتی احتساب کو یہ حق نہ دینا چاہتے تھے کہ وہ ان سے مجرموں کا سا برتاؤ کرے۔ (20)

یہی وہ زمانہ تھا جب مشہور زمانہ "عسکری منٹو اتحاد" وجود میں آیا۔ تقسیم سے قبل منٹو کے خیالات جو بھی رہے ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ایک صاف گو اور کھرا فنکار تھا۔ اس کی سیکولر وسیع المشربی اور انسان دوستی ہر قسم کے شک وشبے سے بالاتر تھی۔ مگر تقسیم کے بعد اپنے ہندو دوستوں کے رویے کی وجہ سے منٹو کے ادبی طرز احساس میں زبردست تبدیلی آئی اور اس میں 'پاکستانیت' کا شعور گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔ (21) 1948ء میں جب منٹو انسان دوستی اور وسیع المشربی کے آفاقی طرز فکر کو مذہب وملت کے امتیاز کی ٹھوس حقیقت کے پیمانے پر ماپتا ہوا لاہور میں وارد ہوا تو عسکری کو اس میں ایک نئے انسان کے آثار محسوس ہوئے تھے جس کی تفصیل انہوں نے اس زمانے میں جابجا لکھی ہے۔ ان دنوں عسکری خود بھی پاکستان میں ایک نئی بو باس اور نئے طرز احساس والے ادب کی ضرورت کی طرف متوجہ کروا رہے تھے۔ اپنی اس آرزو میں انہیں پہلے پہل ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور منٹو کی طرف سے شراکت کا احساس ہوا۔

شاعروں میں انہیں یہ طلب ناصر کاظمی اور سلیم احمد میں نظر آئی تھی۔ خود منٹو بھی یہ چاہتا تھا کہ ترقی پسندی کے مروجہ تصور کو بدلا جائے۔ تقسیم سے قبل ترقی پسند حضرات منٹو کے بہت قائل تھے مگر بعد میں یکا یک اس کے خلاف ہو گئے۔ اس میں کچھ شائبہ عسکری سے منٹو کی دوستی کا بھی تھا۔ منٹو نے اپنی معروف کتاب "سیاہ حاشیے" چھپوائی تو اس میں عسکری کا ایک مضمون "حاشیہ آرائی" مقدمے کے طور پر شامل کرلیا جو انہوں نے اصلاً "نیادور" کے لیے لکھا تھا۔(22) اس کتاب پر عسکری کا دیباچہ ایک غضب ہو گیا۔

اس زمانہ میں عسکری نے منٹو کے ساتھ مل کر ایک نیا ادبی رسالہ "اردو ادب" بھی نکالا جس کے دو شمارے شائع ہونے سے پہلے ہی ایک تاریخی واقعہ بن گئے اور منٹو کے سابق ترقی پسند دوست احمد ندیم قاسمی نے ایک کھلے خط میں منٹو کو خراب کرنے کی ساری ذمہ داری عسکری کے سر مڑھ دی۔(23) یہی نہیں بلکہ ترقی پسندوں کی کانفرنس منعقدہ نومبر 1949ء میں ایک معروف قرارداد کے ذریعے کچھ "رجعت پسند ادیبوں" کے مقاطعہ کی ایک قرارداد بھی منظور کی گئی تھی جن میں معروف ترین نام عسکری، منٹو اور عزیز احمد وغیرہ کے تھے۔(24)

ایک طرف ترقی پسند مصنفین کی انجمن یہ سب کچھ کر رہی تھی، دوسری طرف ذہنی آزادی اور آزادئ اظہار پر غیر متزلزل یقین رکھنے والے عسکری کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اسی زمانے میں جب حکومت پنجاب نے کچھ ترقی پسند رسالوں کو بند کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے نہ صرف ترقی پسندوں کے خلاف لکھنا بند کر دیا بلکہ اس کے خلاف زبردست احتجاج بھی کیا، کیونکہ ان کے خیال میں یوں قید و بند سے ادب کا انداز نہیں بدلا کرتا۔(25) یہی وہ موقعہ تھا جب عسکری کو ذہنی آزادی اور روحانی کشادگی کی جنت پاکستان میں اپنے آدرش ٹوٹنے کا پہلا زبردست جھٹکا لگا تھا۔

عسکری کے نظریۂ ادب میں ترقی پسندی کے ان محدود تصورات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی ان خیالات سے وہ شدید اختلاف رکھتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور میں "حلقہ اربابِ ذوق" بھی ایک فعال ادارہ تھا۔ حلقہ اگرچہ ترقی پسندوں کی مخالفت میں وجود میں نہ آیا تھا مگر میرا جی کی شخصیت، ان کے تصورات اور قیوم نظر وغیرہ کی انتظامی و ادبی سرگرمیوں نے حلقے کو ترقی پسندی سے الگ ایک ممتاز حیثیت دے دی تھی۔ عسکری کو میرا جی کی شخصیت سے شروع ہی سے ایک والہانہ شیفتگی تھی۔ وہ ان کے ادبی تصورات سے کبھی متفق نہیں ہو سکے تھے مگر میرا جی کی شخصیت اور لاہور میں اٹھنے والی اس نئی تحریک نے انہیں شروع ہی سے متاثر کیا تھا۔ جب عسکری دہلی میں قیام پذیر تھے تو حلقے کے اجلاس میں شرکت بھی کر لیتے تھے اور شرارت و مذاق میں کوئی اشغلہ بھی چھوڑ دیتے تھے۔(26) جب وہ لاہور آئے تو حلقے کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ترقی پسندی سے اختلاف کی وجہ سے حلقے کی طرف ان کا رویہ والہانہ لگاؤ کا ہوتا مگر ایسا نہیں تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ حلقے کے

اجلاس میں شریک تو ہو جاتے مگر ایک سرد مہری کے ساتھ۔ انہوں نے حلقے کے اجلاس میں کچھ مضامین بھی پڑھے۔(27) ان تمام رویوں کا سبب عسکری کا وہ تصور ادب تھا جو ترقی پسند نظریۂ ادب اور حلقہ ارباب ذوق کے تصور ادب دونوں سے بالکل الگ تھلگ ممتاز شان کا حامل تھا۔ اسی تصور ادب سے پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کی بحثیں نکلی تھیں۔ چونکہ ان مسائل پر ہم الگ سے بحث کریں گے، اس لیے تناظر قائم کرنے کے لیے یہاں اشارہ کر دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا دہلی اور میرٹھ میں کالج میں پڑھانے کے تجربے اور لاہور میں اس کا بندوبست ہو سکنے کے امکان کے باوجود عسکری نے لاہور میں کسی کالج میں پڑھانے یا کسی قسم کی سرکاری نوکری کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے نظریاتی مخالفین اگرچہ یہی سمجھتے تھے کہ کشمیر کے معاملے، اردو زبان و کلچر، پبلک سیفٹی ایکٹ اور آزادئ اظہار کے مسئلے پر حکومتی موقف کی تائید کی آڑ میں عسکری سرکار دربار میں کسی بہت اونچے منصب پر فائز ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ موخر الذکر معاملات میں عسکری کے ہاں حکومتی حمایت کی جتنی گنجائش نکلتی ہے وہ پاکستانی دور کی ابتدائی 'جھلکیاں' ہی سے ہویدا ہے۔ باقی رہا کسی اونچے عہدے کی طلب کا معاملہ تو ابتدائی تنگدستی اور بڑے کنبے کی کفالتی ذمہ داریوں کے باوجود انہوں نے نہ تو لاہور میں خود کوئی بہت اونچا ہاتھ مارا اور نہ اپنے بھائی حسن مثنیٰ کو ایم اے انگریزی ہونے کے باوجود کسی بڑے عہدے پر پہنچایا۔ حالانکہ ان جیسی ذہنی صلاحیتوں، باقاعدگی کے طور طریقوں اور جدوجہد کی زندگی پر یقین رکھنے والے کے لیے سرکار دربار میں محض اپنی'' خدمات کی عوضی'' پر یہ سب حاصل کر لینا ناممکن نہیں تھا۔ ہاں اس دور میں وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو خطوط میں اپنے بھائی کے روزگار کی ضرورت پر لکھ دیتے تھے،(28) جس سے معلوم ہوتا ہے ان کے لیے عسکری کا بھائی ہونا بھی ایک وجۂ رکاوٹ تھا۔ ترقی پسند حضرات نے عسکری اور منٹو کو سرکاری ڈھنڈورچی کا خطاب دے رکھا تھا۔ مگر سرکار کے ہاں ان لوگوں کی جتنی رسائی تھی اس کا حال'' اردو ادب'' کے اداریوں ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اور پھر عسکری کا اپنا مزاج یہ تھا کہ وہ ہر طرح سے حکومتی اثرات سے الگ رہ کر ایک آزاد لکھنے والے کی زندگی گزارنا چاہتے تھے:

> '' اگر میں اپنے لیے کسی شاندار مستقبل کے خواب دیکھتا ہوں تو 'وفادار' کی حیثیت سے نہیں بلکہ 'جھگوڑے' کی حیثیت سے۔''

(بنام ممتاز شیریں، 2 جولائی 48، **مشمولہ مکاتیب عسکری**، ص 82)

اس جملے کی روشنی میں عسکری کے مزاج کا ایک خاص پہلو مکمل طور پر عیاں ہے۔ سچائی، بے باکی، تلاش اور انتھک جدوجہد کی جو زندگی انہوں نے ایک ادیب اور ایک عام آدمی کے طور پر گزاری، اور ہر قسم کے سرکاری اثرات سے آزاد ہو کر اپنی بات کہنے کی جو روش انہوں نے اختیار کی اس کا پہلا اظہار ان

کی پہلی سرکاری نوکری کی ابتداء ہی میں ہو گیا تھا۔

عسکری اکتوبر 1947ء میں بے سروسامانی کے عالم میں لاہور آئے تھے اور یہاں کسی حویلی یا کاروبار پر قبضہ کرنے کے بجائے رہائش بھی اپنے ایک عزیز کے یہاں رکھی تھی۔ دو اڑھائی برس تک فارغ البالی، ہر طرح کی آزادی اور لکھنے لکھانے کی زبردست مصروفیت اور ترقی پسندوں سے معرکہ آرائیوں کا ہنگامہ خیز دور گزر رہا تھا۔ فروری 1950ء میں انہیں کراچی سے نکلنے والے وزارتِ اطلاعات ونشریات کے سرکاری پرچے "ماہِ نو" کا ایڈیٹر بننے کی پیش کش آئی۔ اس وقت تک ان کے بھائی حسن مثنیٰ کو "پاکستان ٹائمز" میں ملازمت مل گئی تھی جس کی وجہ سے اہلِ خانہ کا معاشی بوجھ ذرا بٹ گیا تو انہوں کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کی اب تک کی زندگی اور خصوصاً لاہور کا یہ مختصر قیام قلمی معرکوں کا دور تھا۔ ان کی لڑائیاں اور اختلافات اصولی ونظریاتی تھے۔ "ذاتی" لڑائی انہوں نے لاہور میں صرف ڈاکٹر تاثیر سے لڑی تھی اور انہیں ایسا منہ توڑ جواب دیا تھا کہ تاثیر جیسے مجلسی اور چونکھی لڑنے کے ماہر کو سوائے خاموشی کے چارہ نہ تھا۔ (29) عسکری لاہور آئے تو پاکستان کے سہانے مستقبل اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے احیائے ثانی کے خواب ان کا سرمایہ تھے۔ بے خوفی، آزادی، سرشاری، مجلسی زندگی اور محفل آرائی کا ایسا دور جو انہوں نے لاہور میں گزارا تھا، ان کی زندگی میں دوبارہ نہ آیا۔ بعد میں وہ کبھی اتنے خوش اور مگن نہ رہ سکے جتنے لاہور میں تھے۔ تاثیر کے خلاف اپنے گرما گرم کالم میں انہوں نے لکھا تھا:

> "ہاں، تاثیر صاحب ایک بات اور یاد رکھیں، وہ اس بھلاوے میں نہ رہیں کہ میں ان کے شہر لاہور یا ان کے ملک پنجاب میں رہتا ہوں۔ میں پنجاب آیا ہی نہیں۔ نہ مجھے پنجاب، سندھ، سرحد، بنگال کا فرق معلوم ہے۔ میں تو پاکستان آیا ہوں اور پاکستان میں رہتا ہوں۔ تاثیر صاحب کی دوستی بڑے بڑے پٹواریوں اور نمبرداروں سے سہی مگر وہ مجھے دھونسانے کا خیال دل میں نہ لائیں... تاثیر صاحب ذرا مجھے سمجھ لیں پھر اگلا قدم اٹھائیں۔"

(جھلکیاں، ص ۳۶۳)

لاہور کی سرزمین سے عسکری کے کوئی نسلی وخصی رشتے نہ تھے مگر یہاں وہ خود کو بیگانہ محسوس نہ کرتے تھے۔ مگر جب وہ کراچی پہنچے تو ان کا ابتدائی تاثر خوشگوار نہ تھا۔ وہاں مشہور افسانہ نگار اور نقاد عزیز احمد ان کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ عسکری ان کے مزاج اور طور طریقوں سے خوش نہ تھے۔ کراچی کا ماحول اور آب و ہوا بھی انہیں موافق نہ آئی تھی۔ لاہور چھوڑ کر کراچی میں محکمہ اطلاعات کی اس سرکاری نوکری میں انہیں کچھ عرصے تک اپنی فکری آزادی کو بھی خیرباد کہنا پڑا تھا۔ ان کے ایک خط بنام آفتاب احمد، 22 اکتوبر 1952ء سے یہ تاثر ملتا ہے کہ محکمہ انہیں ترقی پسندوں کے خلاف ایک "غنڈے" کی طرح

استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یوں وہ اپنی مرضی سے کسی کے خلاف جو چاہے لکھ سکتے تھے مگر کسی دوسرے کا آلہ کار بننا انہیں ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ تھا۔ ان حالات کی وجہ سے وہ "ماہِ نو" سے بھی جلد ہی الگ ہو گئے۔ فروری سے جولائی اگست 1950ء تک وہ چھ سات ماہ کے لیے اس سرکاری ادارے میں رہے اور پھر علیحدہ ہو گئے۔ ترقی پسندوں کے خلاف حکومتی پکڑ دھکڑ کی وجہ سے عسکری نے ان کے بارے میں لکھنا پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ محکمہ اطلاعات میں سرکار دولت مدار کی خواہشات پر پورا نہ اتر سکتے تھے۔ ماہِ نو کی ادارت کے ان چند مہینوں میں انہوں نے جو اداریے لکھے ان کے موضوعات مسلمان قوم، کلچر، تاریخ، ادیبوں کی ذمہ داریاں، شہنشاہ ایران کی پاکستان آمد اور علامہ اقبال جیسے مسائل تھے یعنی وہ موضوعات جن پر وہ پہلے بھی اپنے طور پر لکھتے رہے تھے۔(30) لہٰذا یہ طے ہے کہ انہوں نے حکومت کے زیر اثر ترقی پسندوں کے خلاف کبھی کچھ نہیں لکھا تھا۔

عسکری کے ابتدائی زمانہ کراچی کے حالات اور اس بارے میں ان کے تاثرات ان کے خطوط بنام آفتاب احمد میں بڑی تفصیل سے ملتے ہیں۔ "ماہِ نو" سے فارغ ہوئے تو واپس لاہور کے لیے پر تول رہے تھے کیونکہ کراچی انہیں راس نہ آیا تھا۔ ان کے بھائی بہن اور والدہ بھی لاہور میں مقیم تھے۔ وہ واپسی کے ارادے باندھ رہے تھے کہ کراچی کے ایک نجی تعلیمی ادارے "اسلامیہ کالج" نے ان کا راستہ روک لیا اور نہ نہ کرتے ہوئے بھی عسکری باقی زندگی کے لیے کراچی کے ہو کر رہ گئے۔ اسلامیہ کالج، کراچی کا ایک تاریخی نجی ادارہ تھا جو وہاں کے ایک علم دوست ایم اے قریشی نے قائم کیا تھا۔(31) اس کالج کے شعبہ انگریزی میں ان کے پرانے استاد اور دیرینہ دوست پروفیسر کرار حسین بھی تھے؛ مزید براں ان کے عربک کالج دہلی کے ایک سابق پرنسپل اس زمانے میں اسلامیہ کالج کراچی کے پرنسپل تھے، شاید ان دو حضرات کی وجہ سے عسکری اس کالج میں ٹک گئے۔ اس طرح جولائی 1950ء سے لیکر جنوری 1978ء اپنی وفات کے روز تک عسکری اسی کالج سے وابستہ رہے۔ بیچ میں کئی نشیب و فراز آئے۔ دل میں وہاں سے بھاگ نکلنے کے پروگرام بناتے رہے، دو مرتبہ استعفیٰ دینے کی نوبت بھی آئی مگر اس کالج کے ساتھ ان کا مستقبل لکھا جا چکا تھا۔ لہٰذا وہ آخر دم تک اسی شہر اور اسی کالج میں رہے۔

جیسا کہ ہم نے اشارتاً کہا کراچی کی آب و ہوا انہیں راس نہ تھی اور صحت کے ساتھ ساتھ رہائش کے مسائل بھی درپیش تھے، کراچی میں ان کا بڑا سہارا سلیم احمد تھے جو ان کے میرٹھ کے زمانے کے دوست، زندگی بھر کے مرید اور سب سے ذہین و خلاق مفسر رہے۔ وہ عسکری کو اپنا مرشد مانتے اور خود کو ان کا شاگرد کہتے تھے۔ کراچی میں مرشد کا پہلا پڑاؤ اپنے اسی مرید کے یہاں تھا جو نہایت کسمپرسی کے عالم میں بہار کالونی میں رہتے تھے۔ سلیم احمد نے اپنی معروف نظم "مشرق" میں اس زمانے کے حالات، مہاجرین کے مسائل اور بہار کالونی میں رہائش کی تکلیفیں اور عسکری سے اپنے تعلق کا بیان بڑے تخلیقی پیرائے میں

لکھا ہے۔ بعد میں عسکری اکتوبر 1952ء میں پیر الٰہی بخش کالونی میں قدرے بڑے مکان میں آ گئے تو سلیم احمد اور ان کے اہل خانہ کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ اس طرح یہ لوگ تقریباً ساڑھے چار برس اکٹھے رہے۔(32) کراچی میں عسکری کا اگلا قیام "پی ای سی ایچ سوسائٹی" میں رہا جہاں ان کے بہن اور بہنوئی بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ مکان کرائے کا تھا اور کرایہ عسکری خود ادا کرتے تھے۔ وہ آخر دم تک اس مکان میں رہے کیونکہ یہ ان کے کالج سے قریب تھا۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر وہ اکثر پیدل آتے جاتے تھے۔

اسلامیہ کالج میں عسکری کو شروع میں ساڑھے تین سو روپے دیے گئے تھے۔ خرابی صحت اور کچھ تلون مزاجی کی وجہ سے وہ بار بار واپس لاہور چلے آنے کا سوچتے مگر پھر اسلامیہ کالج میں اپنے طلباء کی ذہانت، تعلیمی ذوق شوق اور ادب خصوصاً انگریزی میں ان کے شغف کی وجہ سے وہاں ان کا جی لگ گیا۔ کراچی جا کر ایک فوری تبدیلی تو ان کے اندر یہ آئی کہ وہ باہر کی زندگی، خارجی معاملات اور فوری و ہنگامی نوعیت کے مسائل سے الگ ہو کر درس و تدریس اور ذہنی و ادبی مسائل کے نسبتاً نفسیاتی و گہرے پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتے چلے گئے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا تھا لاہور میں عسکری کے اڑھائی سالہ قیام کا عرصہ ملک و قوم، تہذیب و کلچر، اجتماعی و ملی امور، اسلامی و پاکستانی کلچر، قومی زبان اور پاکستانی ادب کے مسائل پر بے تحاشہ لکھنے کی وجہ سے بہت مصروف وقت گزرا تھا۔ نئے ملک کو درپیش سیاسی، لسانی، کلچری مسائل، مسلمانوں کے ملی شعور سے ادیب برادری کی عمومی غفلت یا ترقی پسندوں کی طرف سے اجتماعی قومی مفادات کے بارے میں ایک الگ اور مخالفانہ رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے اس عرصے میں اپنی کم سخنی و گوشہ گیرانہ مزاج کے باوجود عسکری بہت ہنگامہ آرا اور سرگرم رہے تھے۔ مگر جب کچھ تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی اپنی ماندگی اور کچھ حکومتی دارو گیر و سختی کی وجہ سے انجمن کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں تو عسکری، جو ان کے بارے میں مخالفانہ لکھنے کا عمل پہلے ہی ترک کر چکے تھے، اس ساری صورتحال سے کچھ دلبرداشتہ ہو گئے۔ اس امر کی گواہی ان کی 1949ء کے بعد کی تحریروں اور نجی خطوط میں وافر ملتی ہے۔ اب وہ پچھلے دو تین برس کی ادبی و نظریاتی گرم بازاری کو یاد کر کے "کم از کم" کا فقرہ اکثر استعمال کرنے لگے تھے کہ اس وقت کم از کم اتنا تو تھا۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک طرف تو یہ اسباب اور دوسری طرف ذاتی طور پر بھی قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں والے جوش و خروش سے باہر آ نکلنے اور کچھ ادبی و تہذیبی معاملات کی طرف حکومتی و سرکاری غافلانہ رویوں کی وجہ سے عسکری پر بھی ایک ردعمل کی لہر چھا گئی تھی۔ ان امور کی بنا پر ان کی کراچی کی زندگی شروع سے ایک اور دنیا کا پتہ دینے لگی تھی۔

فروری 1950ء سے اپنی وفات جنوری 1978ء تک کراچی کا زمانہ قیام عسکری کی ذہنی مصروفیت کا دور تو کہا جا سکتا ہے مگر کم و بیش تین دہائیوں پر مشتمل اس عرصے میں ان کی خارجی و جسمانی سرگرمیاں

محدود تر رہیں۔ کالج سے چھٹیوں کا عرصہ زیادہ تر وہ لاہور یا راولپنڈی میں اپنی والدہ اور بھائیوں کے ساتھ گزارتے اور باقی مدت کراچی میں اپنے تدریسی فرائض میں مگن رہتے۔ جس طرح دہلی اور میرٹھ میں رہنے کے باوجود ان کا ذہنی تعلق لاہور گروپ سے رہا اسی طرح کراچی میں قیام کے دوران بھی ان کا باطنی ربط ضبط اپنے لاہور کے احباب ہی سے زیادہ رہا تھا۔ ابتداً کچھ خارجی اسباب اور زیادہ تر باطنی تبدیلیوں کی وجہ سے کراچی میں بھی ان کی عملی زندگی بتدریج اپنے طلبا میں محدود ہوتی چلی گئی اور ذہناً ان کی دلچسپی بھی فوری نوعیت کے قومی وملکی معاملات سے ہٹ کر ادب کے نسبتاً گہرے مسائل سے ہوتی گئی، جو آخر کار ان کی زندگی کو ایک اور ہی رخ پر ڈالنے پر منتج ہوئی۔

کراچی میں 1951-52ء کے بعد ان کی زندگی میں عشقیہ تجربے کا ایک دور بھی آیا جس کے ہلکے ہلکے آثار ان کے چند خطوط بنام آفتاب احمد میں بھی ہیں اور جس کی سب سے مفصل روداد ڈاکٹر آفتاب ہی نے لکھی ہے کہ اس قلبی واردات میں وہی ان کے اکیلے رازدار اور مشورہ گزار تھے۔ عسکری جیسے چنتہ دل و دماغ کو متاثر کرنے والی یہ خاتون ان کی ایک ذہین شاگرد تھیں۔ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ فریقین شادی پر بھی راضی ہو گئے مگر شومئی قسمت نکل منڈھے نہ چڑھ سکی کہ بیچ میں چودہ سو سال کے تاریخی اختلافات یعنی شیعہ سنی مسئلے نے کھنڈت ڈال دی تھی۔ اس کے بعد عسکری نے ساری زندگی شادی نہ کی۔ (33) ان کی زندگی بھر کا پہناوا کرتا پاجامہ اور اچکن تھی، سوائے زمانۂ عشق کے مختصر عرصے کے جب وہ سوٹ بوٹ اور نائی بلکہ بو بھی استعمال کرنے لگے تھے۔ اس دور میں ان کے اندر ایک عجیب ترنگ سی آگئی تھی اور وہ ادیب برادری اور عمومی ادبی مسائل سے ہٹ کر اپنے شاگردوں میں زیادہ مگن ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں فوٹو گرافی کا بھی شوق ہو گیا تھا جو زرا دیر تک چلا۔ قدرتی مناظر اور دوست احباب کے فوٹو کھینچتے اور خود ہی ڈیولپ کرتے۔ اس زمانے میں ان کے اندر اضطراب اور بے چینی بہت تھی۔ اسلامیہ کالج کو بار بار چھوڑنے کی بات کرتے، واپس محکمہ اطلاعات جانے کی سوچتے، کبھی لاہور لوٹ آنے کا پروگرام بناتے۔

کراچی پہنچنے کے بعد ان کے اندر فوری تبدیلی تو یہ آئی کہ پہلے قومی وتہذیبی مسائل سے تقریباً لاتعلق ہو گئے اور پھر ادب کے انحطاط و جمود کی باتیں کرتے کرتے ایک روز ادب کی موت کا اعلان کر دیا۔ 1948-49ء میں انہوں نے پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کی بحثیں اٹھائی تھیں۔ اب جب کہ 1951-54ء میں ادب کے زوال وموت کی بات کرنے لگے تو ان کے خلاف ردعمل بھی بہت ہوا اور ہم نوائی میں بھی کچھ آوازیں اٹھیں۔ سوال ہے کہ کیا یہ عسکری کے مزاجی تلون اور اضطرابی طبیعت سے اٹھنے والے بگولے تھے، برصغیر کے مسلم شعور وکلچر کے اثرات سے جنم لینے والے پاکستانی خواب کی شکست تھی یا ان معاملات کے پیچھے ان کی کوئی سوچی سمجھی رائے تھی؟ عسکری کے تصور ادب کو اگر تفصیل

سے دیکھا جائے اور پھر فوراً اخذ نتائج کرنے والی ان کی درا کی کو پوری طرح سمجھا جائے تو ان کے اس طرح کے خیالات کی معنویت سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ان کی ذہنی نشو ونما جس دور میں ہوئی تھی وہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں نئے ادب / ترقی پسند ادب کا دور تھا جو بین الاقوامی حالات اور تحریکوں اور رومانویت، جمال پسندی یا ادب لطیف کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا۔عسکری اس جمال پرستی کے سخت مخالف تھے جو اپنے عمومی رویوں اور ادبی حسیت کے اعتبار سے گردوپیش کے ماحول سے یکسر غیر متعلق ہوکر خیالوں اور خوابوں کی دنیا سجائے ہوئے تھی۔اس کے مقابلے میں وہ شروع میں 'نئے ادب' والوں کی اس کاوش کے زبردست قائل تھے جو اس نے اپنے اردگرد کے مسائل سے جڑنے کی خاطر کی تھی۔لیکن 'نیا ادب' جب چند مخصوص مسائل ہی کا ہو کر رہ گیا اور اس کے نثری اسالیب و تخلیقی تجربے میں یکسانیت در آئی تو عسکری اپنی 1945-46ء کی ''جھلکیاں'' ہی میں اس سے بے اطمینانی کا اظہار کرنے لگے تھے۔پھر جب تحریک پاکستان کی ابتداء اور عروج کے دور میں انہوں نے نئے ادیبوں اور ترقی پسندوں کو برصغیر کے مجموعی مسلم شعور سے غافل پایا تو ان کی یہ بے اطمینانی شدید اضطراب میں بدل گئی۔ایسے میں پہلے انہوں نے پاکستانی کلچر اور'' پاکستانی ادب'' کے خدوخال متعین کرنے کی بات کی جو برصغیر کے مسلمانوں کے صدیوں پرانے کلچر اور ادب ہی کی ایک توسیعی اور نئے تخلیقی اطلاق کی ایک صورت تھی۔لیکن اس وقت حکومت کی بعض نااہلیوں، غلط فیصلوں اور تہذیبی و کلچری معاملات کی طرف سے ادیب برادری کی غفلت کی بنا پر وہ کچھ خاموش ہوتے چلے گئے۔

1951-52ء کے بعد وہ جب اپنی ادبی صورت حال کو ماضی یعنی 1933-36ء کے ادبی وفور کے پس منظر میں دیکھتے اور اسکا مقابلہ اس متوقع تخلیقی امنگ سے کرتے جو پاکستان کے قیام کی وجہ سے عموماً زندگی کے ہر شعبے میں اور خصوصاً ادیبوں کے تخلیقی شعور میں آنا چاہیے تھی تو انہیں سخت مایوسی ہوتی۔اہل دانش اور تخلیقی کام کرنے والوں کے سامنے بار بار یہ سوال رکھتے کہ اب ادب ہمارا اس طرح سے اسلوب حیات کیوں نہیں بن رہا جس طرح میراجی کی نظمیں یا منٹو کے افسانے بن جاتے تھے؟ اسی صورت حال کو وہ ''ادب کی موت'' کہتے تھے۔(34)

عسکری کے نظری و فکری رجحان میں ایک اور اہم تبدیلی 1956-57ء کے قریب آئی جب سوویت روس کی طرف ان کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا تھا۔مسئلہ یہ تھا کہ قیام پاکستان کے دنوں میں ان کی توجہ صرف پاکستان کے مسلمانوں تک ہی نہیں تھی بلکہ پورا عالم اسلام اور وہاں کے باسیوں کے معاشی و سماجی حالات ان کی دلچسپی کا موضوع تھے۔1956ء میں جب نہر سویز کے قومیائے جانے کو بہانہ بنا کر فرانس اور برطانیہ نے مصر پر حملہ کر دیا، جن کی پشت پناہی امریکہ کر رہا تھا، تو جمال عبدالناصر نے عرب دنیا کو اتحاد کی دعوت دے ڈالی۔عالم اسلام کی وحدت اور یورپ و امریکہ کے پنجے سے اس کی آزادی کی

خواہش عسکری کے اندر پھر سے جوش مارنے لگی۔ ادھر حکومت پاکستان بتدریج خود کو امریکہ کا ہمنوا بنا رہی تھی۔ ایسے میں عسکری نے یورپ اور خصوصاً امریکی پالیسیوں پر "امروز" کے کالموں میں سخت تنقید کی اور روس نے مصر کی جو حمایت کی تھی اس کی مکمل کر تعریف کی۔ ان کی آرزو تھی کہ عالم عرب کا یہ اتحاد عالم اسلام کے اتحاد میں بدل جائے۔ وہ ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کو بھی جھنجوڑتے رہے کہ صرف ادب وفن میں "مست" رہنے کے بجائے کچھ اپنے ملک وقوم کا بھی سوچیں۔ (35) عسکری یہ سب کچھ اپنے عشق کے دور آخر یا ناکامی 57-1956ء میں کر رہے تھے جب وہ بقول ڈاکٹر آفتاب احمد: "اپنے آپ میں سکڑ سمٹ کر رہنے لگے تھے۔" (36)

یہ ایک طرح سے ان کی تبدیلیٔ حال کا دور تھا۔ اکتوبر 1958ء میں ایوب خان کا مارشل لاء آگیا، جو عسکری کے لیے ایک اور صدمہ ثابت ہوا۔ ان کے ذہن میں ایک آزاد جمہوری پاکستان کا جو تصور تھا وہ تو پہلے ہی مجروح ہو چکا تھا اس پر مارشل لاء کے جبر واستبداد نے ان کی رہی سہی امیدیں بھی ختم کر ڈالیں اور اس واقعے سے وہ بہت دلبرداشتہ ہوئے۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے ساتھ ہی ادیبوں کی ایک تنظیم "رائٹرز گلڈ" کا قیام عمل میں آیا، جس کا پہلا اجلاس کراچی ہی میں ہوا جہاں عسکری اس سے متعلق اپنے مخصوص بے نیازانہ ردعمل کے ساتھ سب سے ممتاز نظر آئے تھے۔ وہ خود تو اس تنظیم کے ساتھ تعاون کیا کرتے، ان کے دوستوں میں سے بھی جس جس نے اس میں شرکت کی وہ اس سے ناراض ہو گئے۔ انہوں نے شاہد احمد دہلوی کا بھی منہ نہ رکھا۔ مشہور صحافی ابن الحسن جب انہیں گلڈ کے اجلاس میں شرکت پر راضی کرنے کے لیے آئے تو عسکری کا جواب تھا: "پولیس کو بھیج کر بلوا لینا۔" (37)

یہ درست ہے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں وہ خود ادیبوں کی ایک ایسی تنظیم کی ضرورت کے شدت سے قائل تھے جو اہم قومی مسائل میں ملک وقوم کی امنگوں کا ساتھ دے اور کشمیر کے مسئلے پر خود انہوں نے دستخطی مہم بھی چلائی تھی مگر حکومتی اشارے پر بننے والی کسی ایسی تنظیم کو وہ ادب کے لیے نیک فال نہ جانتے جس کے مقاصد کچھ اور ہوں۔ (38) ان کے نزدیک ادیب کا کردار ایک باغی اور ناقد کا تھا، جو ظاہر ہے کہ سرکاری سرپرستی اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ادیبوں کی معیت میں ممکن نہیں تھا۔ خود اپنے لیے بھی انہوں نے یہی کردار پسند کیا تھا اور تا بمقدور ساری زندگی اس پر عمل بھی کرتے رہے تھے۔

عسکری کے بارے میں ایک معروف رائے یہ ہے کہ ان کی زندگی میں کچھ وقفے ایسے آتے تھے جب وہ لکھنا لکھانا ترک کر دیتے تھے۔ ہماری تحقیق کے مطابق اس میں ذرا مبالغہ ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان کے لکھنے کی رفتار میں بعض اوقات کی ضرور آتی رہی ہے۔ باطنی طور پر تجربہ عشق کی ناکامی اور خارجہ طور پر مارشل لاء کے نفاذ کے انقباض نے ان کے اندر ہمیشہ سے موجود تلاش وجستجو کے ایک مسلسل عمل کے

لیے مہمیز کا کام کیا۔ ان کے ادبی تجربات انہیں بتدریج مشرق و مغرب کے ادبی شعور اور تہذیب و کلچر کے جن لاینحل سوالوں سے دوچار کر رہے تھے، ان کی وجہ سے وہ بالآخر مذہب و تصوف اور مابعد الطبیعیاتی عرفان کی وادیوں میں جا نکلے تھے۔

عسکری کی ادبی زندگی کا آغاز ایک صاحب اسلوب اور رجحان ساز افسانہ نگار کے طور پر ہوا تھا، مگر جلد ہی ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا رخ تنقید کی طرف ہو گیا تھا، جس کا پہلا بڑا نمونہ ان کے افسانوی مجموعے جزیرے کے آخر میں ''اختتامیہ'' کے عنوان سے وہ تحریر (نوشتہ فروری 1943ء) ہے جو فکشن کی تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ان کے دور آخر (1960ء کے بعد) کے تصورات کے بیج بھی رکھتی ہے۔ ان دو ادوار کے درمیان ان کے خیالات میں کئی نشیب و فراز آئے جن میں بظاہر مشرقین و مغربین کا اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر آخر میں وہ جن نتائج پر پہنچے تھے ان کے آثار مذکورہ ابتدائی تحریر میں صاف نظر آتے ہیں۔

ان کی زندگی کے آخری اٹھارہ برس جن نظریات کی وکالت و حمایت میں گزرے ان کی ادبی قدر و قیمت خواہ کچھ ہو وہ ادبی تنقید کے معروف مفہوم میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مسائل کو مختصراً ان کے ''تصور روایت'' کے عنوان سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان مسائل سے ان کا شغف 1958-59ء میں شروع ہوا اور اپنی زندگی کے باقی بیس سال وہ انہی تصورات کے مختلف پہلو اجاگر کرتے رہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ عسکری کی زندگی میں یہ تبدیلی ''رینے گینوں'' سے متاثر ہونے کی وجہ سے آئی تھی۔ یہ بات تو درست ہے کہ ان کے ''تصور روایت'' کا بڑا حصہ ''رینے گینوں'' سے ماخوذ ہے مگر ان کی ساری تحریریں اگر پیش نظر رہیں تو نظر آتا ہے ان کے اندر شروع ہی سے مغربی ادب اور فکر و فلسفے کی طرف سے ایک بے اطمینانی موجود تھی۔ وہ خود اگرچہ مغربی ''جدیدیت'' کے پروردہ اور اس کے ایک اہم وکیل رہے تھے مگر ہمیشہ سے وہ اس کی کمزوریوں اور خامیوں کی ناقدانہ پرکھ بھی کرتے رہے تھے۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ہر فکر اور قدر کی نفی کرتے ہوئے اثبات کی طرف بڑھنے اور اپنے سابقہ موقفات و خیالات پر بھی نئے سرے سے ناقدانہ نظر ڈالنے کا طریقہ عسکری کی ''جدیدیت'' ہی کا حصہ تھا۔ رینے گینوں سے ان کی واقفیت 1946-47ء میں بھی تھی۔ (39) مگر اس سے اثر قبول کیا بھی تو 1958ء کے بعد کیا جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کی یہ باطنی قلب ماہیت کسی وقتی جوش یا اعصابی تھکن کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کے گذشتہ بیس پچیس برس کے تجربات سے جنم لینے والی بے اطمینانی کا نتیجہ تھی اور انہوں نے رینے گینوں کا اثر بھی اس وقت قبول کیا جب ان کے اپنے ادبی تجربات نے جو گویا ان کی چھٹی حس کا کام کرتے تھے، انہیں چند خاص نتائج تک پہنچایا تھا، جن کی تصدیق گینوں سے مل رہی تھی۔

اس کے بعد وہ مطالعہ قرآن حکیم میں منہمک ہو گئے اور تصوف و عرفان کی اس روایت کے متلاشی ہوئے جو اسلام کی عقلی و فکری روایت کے ساتھ ساتھ باطنی سلوک و جمالیاتی فنون اور سماع و موسیقی والی جہت کی بھی جامع تھی۔ اس سلسلے میں ان کا سیر و سفر رینے گینوں، ابن عربی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ سے ہوتا ہوا مولانا اشرف علی تھانوی پر ختم ہوا جن کی تحریروں میں علم و عرفان کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت سے "ادبی نکات" بھی دریافت کر لیے تھے۔ اب ان کا کہنا تھا کہ ہم اردو ادب کی اصل "روایت" کو اپنے دین، تہذیب اور تصوف کے بہترین اور مستند ترین نمائندوں کی تحریروں کے بغیر سمجھ ہی نہیں سکتے اور اس کے لیے ہمیں مغربی فکر کی ہر اس شے سے دست بردار ہونا پڑے گا جو جدید تہذیب کی ترقی و کمال کی علامت ہے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں انہوں نے رینے گینوں کی کتابوں سے مغربی فکر کے بنیادی خدوخال کا ایک خاکہ بھی تیار کیا تھا جو مفتی محمد شفیع کے مدرسے دارالعلوم کراچی کے طلباء کو مغربی فکر کی مبادیات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک کورس کے طور پر پڑھائے جانے کے لیے تھا۔ اسی عرصے میں انہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک کتاب "انتباہات المفیدہ" اور مفتی محمد شفیع کی "اسلام کا نظام تقسیم دولت" اور تفسیر "معارف القرآن" کی پہلی جلد کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔

عسکری کی نوعمری اور ذہنی نشوونما اگرچہ بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان میں پیدا ہونے والی نئی تعلیم یافتہ نسل کی طرح مذہبی تشکیک اور ترقی پسندانہ فضا میں ہوئی تھی جس کے اندر تنہائی و بیگانگی، تبدیلی و تغیر، انکار و منفیت اور اقدار کی شکست و ریخت کا گہرا احساس تھا۔ اس دور کی نئی حسیت کے ثمرات عسکری ہی کے الفاظ میں یہ تھے:

> "ناقابل بیان افسردگی، بے حد و حساب دیوانگی، ناقابل علاج مایوسی،
> بے نام خوف، مبہم تمنائیں، کبھی نہ سیر ہونے والی آرزوئیں اور عصبی خلل"

(عسکری کے افسانے، ص 190)

جن کی وجہ سے ذہین و خلاق نوجوانوں کا آخری سہارا اپنے ذاتی تجربات تھے اور واحد دلچسپی جنسی اشغال اور ان کے تخلیقی بیان میں سمٹ آئی تھی۔ عسکری کے عنفوان شباب کا عرصہ بھی اسی ذہنی ماحول میں بسر ہوا تھا مگر تجزیے کا "اقتضا" گواہ ہے کہ ان کے اندر ان مسائل کی تجزیاتی قوت کا ادراک اور زندگی، ادب اور فن کو مغربی حسیت سے الگ کسی پائیدار، یعنی ہندوستانی و مشرقی، بنیاد پر استوار کرنے کا زبردست احساس ابتدائے سفر میں ہی موجود تھا۔

ابتدا ہم سب کی طرح وہ محض ایک کلچری مسلمان تھے۔ قیام پاکستان کے دنوں میں برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی و تخلیقی سفر اور مسلم کلچر کے پیدا کردہ عظیم الشان نمونوں سے رغبت کی بنا پر ان کا

کلچرل شعور بے حد فعال ہو گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام کا علمی و شعوری مطالعہ انہوں نے 59-1958ء میں ہی شروع کیا تھا۔ اور خود اپنے ایک بیان کے مطابق انہوں نے ابتدا قرآن پاک کا مطالعہ بھی ولیم رائخ کے" کائناتی اور کونیاتی تموجات" کا سراغ لگانے کی خاطر کیا تھا۔(40) مگر اپنی خداداد ذہانت، وسعت مطالعہ، اخذ نتائج میں محیر العقل تیزی اور درست وثقہ دینی فہم کی وجہ سے چند برس کے اندر اندر انہیں مفتی محمد شفیع اور دار العلوم کراچی کے دوسرے احباب کی نظر میں ایک اہم حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کا بنیادی حوالہ تو ہمیشہ ادب ہی تھا مگر اب وہ ادب کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنے لگے تھے۔ مغربی فکر کی بنیادی خرابیوں اور روایتی تصور کائنات پر ان کے مضر اثرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ان کی توجہ کا رخ ان تصورات کی نشاندہی کی طرف ہو گیا تھا جو جدیدیت کو جنم دینے کا باعث بنے تھے۔

اپنے پرانے ساتھیوں میں سے اب ان کی ذہنی ہم آہنگی صرف سلیم احمد اور ڈاکٹر اجمل ہی سے رہ گئی تھی۔ دیگر احباب کو وہ اپنی سرگرمیوں سے آگاہ تو کرتے رہتے مگر ان کی طرف سے اپنی نئی تحریروں، منصوبوں اور تصورات پر اعتراض کے جواب میں صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتے، بحث نہ کرتے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے جو چیزیں لکھیں، ترجمہ کیں یا جو ان کے مستقبل کے منصوبے تھے ان کی تفصیل اب زیادہ تر ان کی کتاب وقت کی راگنی، مقالات عسکری اور دوست احباب کے نام لکھے گئے 1960ء کے بعد کے خطوط میں موجود ہے۔ ان میں سے بعض تحریریں ترجمہ ہو کر فرانس کے بعض رسائل میں بھی چھپتی رہیں اور وہاں ان پر بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ ان کے نامکمل منصوبوں میں تفسیر قرآن کے انگریزی ترجمے کے علاوہ مسلمانوں کے روایتی علوم و فنون، علم بلاغت، بیان و بدیع کی اصطلاحات کے روایتی معنی کا تعین اور ان کے انگریزی تراجم بھی تھے۔ اب کلاسیکی تنقیدی شعری اصطلاحات مثلاً خیال آفرینی، رنگین بیانی، اور تازہ گوئی وغیرہ کی بازآفرینی، اور کلاسیکی موسیقی، خصوصاً اس کی صنف "خیال" گائیکی کی معنویت سمجھنا سمجھانا ان کا خاص سروکار تھا۔ اس کے لیے انہوں نے کلاسیکی گائک استاد بندو خان اور ان کے صاحبزادے امراؤ بندو خان کی خصوصی محفلوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔(41) ان فنون سے عسکری کی دلچسپی بہت پرانی تھی۔ مسلمانوں کے فن تعمیر، مساجد کے ڈیزائن، مصوری، فوٹوگرافی اور فلم آرٹ پر بھی انہوں نے پہلے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ موسیقی اور رسم الخط جیسے بظاہر "سیکولر" مسائل کو بھی وہ تہذیب کی ماورائی جہتوں سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔(42) یہ سب ان کے لیے محض ذہنی ورزش نہیں تھی بلکہ اب ان کی عملی زندگی، رفتار و گفتار اور وضع قطع میں بھی اس کے اثرات آنے لگے تھے۔ وعدے اور وقت کی پابندی ان کی زندگی بھر کا معمول تھا اب پابندی نماز باجماعت بھی ان کے روزمرہ کا حصہ بن گئی تھی۔ بعض موقعوں پر ان کے سر پر دوپلی ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح بھی نظر آیا کرتی تھی۔ ثناء الحق صدیقی نے بعد

کے زمانے میں ان سے اپنی ملاقاتوں کے احوال (مشمولہ مکالمہ نمبر 5) میں لکھا ہے کہ وہ دین کے معاملے میں سختی کے قائل نہ تھے بلکہ صوفیاء کے مسلک رواداری کو بہتر سمجھتے تھے۔

عسکری کی زندگی کا آخری بڑا سیاسی واقعہ ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت سے ان کا بے پناہ شغف ہے۔ 1960ء کے بعد وہ بتدریج گوشہ گیر ہوتے جا رہے تھے۔ ملکی سیاست میں اب ان کی دلچسپی بھی برائے نام تھی۔ مگر 1970ء کے شروع میں جب بھٹو ایک زبردست سیاسی قوت کے طور پر ابھرنا شروع ہوئے تو ان کی سیاسی دلچسپیاں پھر سے جاگ اٹھیں اور وہ انہیں پاکستان کے سیاسی، معاشی اور سماجی بے انصافی کے مسائل کا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔ بھٹو صاحب کے پورے عرصہ اقتدار میں وہ ان کے شیدائی رہے مگر جب ضیاء الحق صاحب کا مارشل لاء آ گیا اور بھٹو صاحب کا دور حکومت ختم ہوتا نظر آیا تو وہ اس میں بین الاقوامی قوتوں کا ہاتھ دیکھتے تھے۔ انہیں استعماری قوتوں کو للکارنے والے ہر لیڈر سے دلچسپی تھی۔ قائداعظم، احمد سوئیکارنو، جمال عبدالناصر، یاسر عرفات اور اب ذوالفقار علی بھٹو۔ عسکری جس طرح کسی پر ریجھتے تھے اسی طرح جلد بدک بھی جاتے تھے اور ان کے مزاج میں ایک خاص طرح کی شدت بھی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بعض اوقات خاص قسم کے نتائج اخذ کر کے دوسروں کے بارے میں عجیب رویہ اختیار کر لیتے تھے۔ خواجہ منظور حسین، شاہد احمد دہلوی اور سلیم احمد سے ان کی ناراضگی ان کے مزاج کی اسی جہت کی عکاس تھی۔

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ 1950ء میں کراچی چلے جانے کے بعد وہاں ان کی قلمی و ادبی سرگرمیاں تو کسی نہ کسی انداز سے جاری رہیں مگر لوگوں سے میل ملاقات کم سے کم ہوتا گیا۔ ان کے پرانے ملنے والے ان کے ہاں چلے جاتے تو ان سے چھ چھ سات سات گھنٹے کی صحبت رہتی۔ بہت قریبی مزاج شناسوں کی محفل میں تو وہ خوب بولتے مگر کسی اجنبی کے آ جانے پر وہ خاموش ہو جاتے۔ چائے اور سگریٹ سے تو انصاف کرتے مگر باتیں کم سے کم کرتے۔ محلے پڑوس کے عام ملنے والوں سے تو ان کا برتاؤ بے تکلفانہ ہوتا مگر بہت پڑھے لکھے معروف ادیبوں سے وہ تکلف کرتے تھے۔ اسلامیہ کالج میں، جہاں انہوں نے اکیس برس گزار دیے، اپنے ہم کاروں سے ان کے میل جول کی کوئی خاص شہادت نہیں ملتی۔ ہاں طلباء کے ساتھ ان کا تعلق بے حد محبت اور بے تکلفی کا ہوتا۔ کالج میں وہ اکثر چھوٹے دروازے سے داخل ہوتے اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ کلاس اگر چھوٹی ہوتی تو شاگردوں کو وہیں بلا لیتے مگر نظم و ضبط کی سخت پابندی کرتے ہوئے ان سے بے تکلفی کی گفتگو کرتے۔ دھواں دھار تقریر ان کے بس کی بات نہ تھی۔ بات چیت کے انداز میں طلباء کو بھی شریک گفتگو رکھتے تھے۔ لیکچر کے دوران سگریٹ بھی پیتے اور پانی کے گھونٹ بھی لیتے رہتے۔ ان سے پڑھنے والے طلباء صرف انگریزی زبان و ادب ہی سے واقفیت نہ بڑھاتے بلکہ دیگر زبانوں کے ادب و تہذیب اور کلچری و مذہبی

مسائل سے بھی اچھا خاصا آگاہ ہو جاتے تھے۔ چھوٹی کلاس کے لڑکوں کو ان کے پڑھانے کا انداز بہت ان گھڑ لگتا تھا، جس کی پرنسپل سے شکایت بھی کی گئی تھی۔ جواب طلبی پر انہوں نے بلا تامل 'کسی اور استاد کا بندوبست' کرنے کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔(43) اسی طرح اپنے چھوٹے بھائیوں اور بھانجوں پر وہ بے تکلفانہ شفقت کرتے تھے۔ ان کی تعلیم، روزگار، مشاغل اور روزمرہ کے معاملات میں پوری طرح شریک رہتے تھے۔ ان کے بھانجے نجم الحسن نعیم اختر نے ان پر ایک خاکے میں ان کی گھریلو معاملات کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے جس سے ان کے مزاج کے بعض نادر گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔(44)

عسکری کی زندگی بہت خوش سلیقہ تھی۔ بسا اوقات ان کے مزاج میں شدت تو در آتی تھی مگر ان میں لاابالی پن اور بے قاعدگی قطعی نہیں تھی۔ وہ اگرچہ خوش گفتار نہ تھے مگر خوش مزاجی اور لطافت طبعی سے انہیں بہرہ وافر ملا تھا۔ خوش طبعی اور شوخ نگاری جس طرح ان کے اسلوب تحریر کا حصہ تھی اسی طرح اچھے اور تیکھے جملے ان کی گفتار کا بھی حسن تھے۔ میرٹھ سے لیکر دہلی اور لاہور سے لیکر کراچی تک انہیں لمبی سیروں اور چہل قدمیوں کا شوق رہا۔ پرانے ملنے والوں سے لیکر ان کے شاگردوں تک کبھی کو ان کے ساتھ ہم قدمی کا شرف رہا تھا۔ آخری زمانے میں کلاسیکی موسیقی سے پہروں لطف اٹھانا بھی ان کے معمول میں داخل تھا۔ جمال پانی پتی راوی ہیں کہ ایک دفعہ وہ ہمیں بنا بتائے ساتھ لیکر کلفٹن چلے گئے اور کشتی میں سب کو بٹھا کر ایک معروف استاد سے راگ سنواتے رہے۔ ان کے انتقال پر پی ٹی وی پر نشر ہونے والے ایک پروگرام میں آپا ثریا بجیا نے بتایا کہ وہ ہمارے ہاں گھر کے عام افراد کی طرح بے تکلفانہ آتے تھے اور فرمائش کرتے کہ "چائے کے ساتھ ولایت خاں کا "ایمن" بھی ہو تو مزہ آجائے"۔

عسکری اپنی کسی تحریر میں، اگر وہ چھپنے کے لیے ہوتی، تو اس میں اپنی ذاتی زندگی اور مسائل کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ البتہ احباب کے نام ان کے خطوط میں ایسے اشارات بکثرت موجود ہیں۔ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ کسی خاص بیماری میں تو کبھی مبتلا نہیں رہے مگر گلے، معدے اور انہضام کے مسائل اکثر درپیش رہتے تھے۔ ایلوپیتھک علاج کی نسبت وہ یونانی طب کا طریقہ علاج پسند کرتے تھے اور عمومی صحت کے لیے روزمرہ کی ورزشوں اور کھانے کے معمولات پر بہت دھیان دیتے تھے۔ وہ احتیاط، پرہیز اور سادہ و کم غذا کو علاج سے بہتر بتاتے تھے۔ اپنے بھائی حسن مثنیٰ کے نام ایک خط میں تو انہوں نے ایک اچھا خاصا "ہدایت نامہ مریضاں" لکھ رکھا ہے جس سے ہم سا بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔(45) اپنی صحت کے بارے میں وہ غیر معمولی طور پر ذکی الحس تھے۔ اس لیے کسی بڑی بیماری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے البتہ بعض جگہوں اور خصوصاً بند ماحول سے انہیں الجھن ہوتی تھی۔ چونکہ وہ اے سی میں نہیں بیٹھ سکتے تھے، اس لیے کبھی ہوائی سفر بھی نہیں کیا۔ عام گاڑی میں سفر کرتے تھے۔ ان کے بھائی حسن مثنیٰ نے راقم کو بتایا کہ ڈاکٹر آفتاب احمد کا کہنا تھا کہ آخری برسوں میں عسکری جب جتنے تھے

تو ان کا چہرہ سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ جس سے انہوں نے بعد ازاں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انہیں بلند فشار خون کا عارضہ رہا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عسکری نے خود یا ان کے کسی اور ملنے والے نے بھی ان کے عارضہ قلب یا بلڈ پریشر کا ذکر نہیں کیا۔

18 جنوری 1978ء کی صبح وہ حسب معمول کالج کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ ابھی کالج کے گیٹ کے پاس بھی نہ پہنچے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ چلتی سڑک پر گر گئے۔ انہیں ٹیکسی پر گھر پہنچایا گیا۔ ابھی ہوش میں تھے۔ ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا، خود زینے چڑھ کر اپنے کمرے میں گئے۔ چپ چاپ پلنگ پر لیٹے اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے دوسرے دورے کے سبب صبح آٹھ بجے کے قریب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی نماز جنازہ مفتی محمد تقی عثمانی نے پڑھائی اور تدفین دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں مفتی محمد شفیع کے قریب ہوئی۔ معروف ادیبوں میں کم ہی لوگوں نے ان کے سفر آخرت کا احوال لکھا ہے۔ جمیل الدین عالی کے نامکمل خاکے میں البتہ اس کی کچھ تفصیل ہے۔

عسکری کے سفر حیات اور زندگی کی عملی سرگرمیوں میں ڈرامائیت نام کی کوئی شے نہیں۔ وہ قصبہ سراوہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے اور کراچی میں زندگی کا طویل مگر گوشہ گیر عرصہ گزار کر فوت ہو گئے۔ الہ آباد، دہلی، لاہور اور کراچی کے علاوہ وہ کہیں زیادہ عرصے تک ٹھہرے بھی نہیں اور نہ کبھی کسی دوسرے ملک کے سیر سپاٹے کی خواہش ہی کی ماسوائے 1952-53ء میں ایک مختصر سے عرصے کے جب وہ عمومی ملکی حالات، تعلیمی بدنظمی اور کچھ شوریدگی عشق کی وجہ سے بار بار فرانس بھاگ جانے کی باتیں کرنے لگے تھے، جس کی تفصیل اس زمانے کے خطوط بنام آفتاب احمد میں موجود ہے۔ لیکن اتنی محدود و تنگ و تاز کے عرصے اور علاقے کے باوجود وہ ہمارے ماضی قریب کی ادبی تاریخ کے ایک انتہائی ہنگامہ آرا اور بحث انگیز شخصیت تھے۔ ساری زندگی کتابوں، نظریات اور تصورات سے تعلق رکھا مگر ان کا ہر نظریہ اور تصور مجموعی و اجتماعی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے تعلق رکھتا تھا اور ادب، تہذیب، کلچر، تاریخ، سیاست، سماج، مذہب اور مابعد الطبیعیاتی امور کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا تھا۔ وہ جب لکھتے تھے تو مشرق و مغرب کی خبر لاتے تھے۔ مگر ان کے اپنے روزمرہ کے معمولات محدود اور ضروریات محدود تر تھیں۔ انہیں کبھی زیادہ پریشان نہیں دیکھا گیا، کبھی کوئی الجھن گھرتی تو ایسے ہی ان کی خاموشی ذرا گہری ہو جاتی۔ یہ کمال انہوں نے محدود ضروریات کے ساتھ زندہ رہنے کے ہنر سے حاصل کیا تھا۔(46)

اسلامیہ کالج میں انہوں نے لیکچرر کے طور پر ملازمت شروع کی تھی۔ اپنی وفات کے وقت وہ سینئر پروفیسر تھے۔ اس دوران انہیں کئی مرتبہ پرنسپل بننے کی پیش کش ہوئی جو انہوں نے قبول نہ کی۔ ایک استاد کے طور پر پڑھانا ہی ان کا نصب العین تھا۔ دہلی اور لاہور کے زمانے میں انہوں نے ریڈیو کے لیے بھی بہت لکھا تھا مگر بعد میں یہ بھی چھوڑ دیا۔ ٹی وی سے بھی تعلق رکھا ہی نہیں۔ افتخار عارف راوی ہیں کہ

انہوں نے عسکری کو ایک ٹی وی پروگرام میں بلانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر وہ مان کر نہ دیے۔ حتیٰ کہ انتظار حسین نے افتخار عارف ہی کی فرمائش پر عسکری کے ایک افسانے کو ٹی وی ڈرامے میں ڈھالنے کا ارادہ کیا مگر عسکری اس پر بھی ناراض ہوئے۔(47)

انہیں ٹی وی سے کد نہ تھی بس ایک اصول ٹھہرالیا تھا۔ بھٹو سے رغبت کے زمانے میں وہ گھر میں ٹی وی بھی لے آئے تھے۔ باقی پروگراموں کو تو لہو ولعب سمجھا کئے مگر خبریں اور بھٹو کی تقریریں دلچسپی سے سنتے تھے۔ وہ مشاعروں میں بھی شریک نہ ہوتے تھے۔ شاعری پر ان کی جتنی نظر تھی وہ معلوم ہی ہے مگر ان کی گفتگو میں کبھی کوئی شعر نہ آتا تھا۔ مجبوری ہوتی تو ایک آدھ مصرع یا اس کا کوئی ٹکڑا نثر کے انداز میں بول دیتے تھے۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان وادب سے ان کا شغف ساری زندگی رہا مگر ڈاکٹر آفتاب احمد کا کہنا ہے کہ ان کی بات چیت میں انگریزی کے الفاظ بھی شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فرانسیسی ادبیات سے انہیں شروع ہی سے لگاؤ تھا مگر عسکری کی فرانسیسی دانی اپنی جگہ ایک بحث انگیز مسئلہ رہی ہے۔ ایسی شہادتیں وافر موجود ہیں جو دہلی اور لاہور کے ہی زمانے ہی سے ان کی فرانسیسی سے واقفیت کا پتہ دیتی ہیں۔ مظفر علی سید نے عسکری پر اپنے غیر مطبوعہ خاکے ''ایسے پھر خانماں خراب کہاں'' میں 1948ء میں ان سے فرانسیسی پڑھنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خود انہوں نے محمد ارکون کے نام اپنے خط 25 نومبر 1975ء میں لکھا ہے انہوں نے فرانسیسی میں تقریباً 300 صفحے خطوط کی شکل میں لکھے ہیں جو فرانسیسی مجلے روایتی مطالعات میں چھپتے رہے ہیں۔(48) البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے دورِ آخر کے بہت سے مضامین فرانسیسی میں ترجمہ ہو کر وہاں ضرور شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں سے بعض اب انگریزی اور اردو میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں اور مقالاتِ عسکری میں شامل ہیں۔

نام ونمود کی خواہش تو ان میں پہلے بھی کبھی نہ تھی، لیکن دورِ آخر میں یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ادیبوں کی بحث میں کبھی ان کا نام بھی آئے۔(49) انہوں نے جتنی گمنامی کی خواہش کی ان کی تحریریں اتنی ہی چمکیں۔ ان کے اٹھائے ہوئے مباحث ہماری تنقید میں آج بھی زندہ ہیں۔ اپنی زندگی میں انہوں نے اپنے صرف دو افسانوی مجموعے جزیرے، قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے اور دو تنقیدی مجموعے انسان اور آدمی اور ستارہ یا بادبان چھپوائے تھے۔ ان کا تقریباً اسی فیصد کام مطبوعہ صورت میں رسائل و اخبارات میں بکھرا پڑا تھا جن کو مدون کر کے چھپوانے کا انہوں نے کبھی تردد نہیں کیا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری میں دنیا جہان کی کتب موجود تھیں مگر ان کے انتقال کے بعد پی ٹی وی کے ایک تعزیتی پروگرام کے لیے ان کی کتب کی جب تلاش ہوئی تو ان کے گھر سے ان کی اپنی ایک کتاب بھی نہ نکلی۔ انہوں نے خود اپنی کتابوں کو بھی اس قابل نہ جانا تھا کہ سنبھال کر رکھتے۔

عسکری بظاہر ایک مردم بیزار اور کم چڑھے نقاد کا تاثر دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے باطن میں سراپا تعلق ہی تعلق تھے۔ انہوں نے "روح زماں" سے تعلق جوڑ رکھا تھا۔ انہوں نے 16 ویں صدی کے بعد سے یورپ و امریکہ کی تمام فکری، تہذیبی اور ادبی تاریخ و تحریکوں اور ان سے جنم لینے والے عہد جدید کے شعور کو صرف اپنی ادبی تربیت و حسیت سے جان کر روایتی مذہب، تصوف اور مابعد الطبیعیات کی روشنی میں اس کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا تھا۔۔۔۔ یہ شاید ان کے تاریخی نام "محمد اظہار الحق" ہی کی ایک جہت تھی جو ان کی ہر دور کی تحریروں میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

عسکری کے تنقیدی تصورات اورادبی خدمات

عسکری کے تنقیدی تصورات اور ادبی خدمات کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر اور ماحول کو سمجھنا ضروری ہے جس میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اور انہوں نے لکھنا شروع کیا۔

برصغیر پاک و ہند میں 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کو جب مکمل غلبہ حاصل ہو گیا تو ان کی تمدنی و تہذیبی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ 1865ء میں لاہور میں چند سرکردہ انگریزی حکام کے اشارے سے ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائیڈ نے "انجمن پنجاب" کی بنیاد رکھی تو اردو کی دو معروف اور دور رس اثرات کی حامل شخصیتیں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی اس کی روح رواں تھیں۔ برصغیر میں جدید اردو ادب و شاعری کا آغاز انہی دو بزرگان ادب کی تنقیدی و تخلیقی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ کرنل ہالرائیڈ کے نزدیک اردو نظم چونکہ طرح طرح کے "عوارض، تنزل اور بدحالی" کا شکار تھی اس لیے انہوں نے اس کی ترقی کے سامان تجویز کرتے ہوئے آزاد اور حالی کی ذہنی رو کو ایک خاص رخ پر ڈھالنے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ (50)

کلاسیکی اردو شاعری جس کی بنیاد ایک خاص تصور کائنات اور شعریات پر تھی، آزاد اور حالی کی عہد ساز کتب آب حیات اور مقدمہ شعر و شاعری سے جنم لینے والے تنقیدی خیالات کی روشنی میں اپنے کلاسیکی معیارات کے ساتھ اب پوری طرح قابل قبول نہ رہی تھی، کیونکہ اس میں "مبالغہ و بلند پروازی، لفاظی و شوکت الفاظ" اور "پیچیدہ و دور از کار استعارے" بھرے ہوئے تھے۔ ان عوارض کو دور کرنے کے لیے آزاد نے سادگی کو اہم وصف بتایا جسے آگے بڑھاتے ہوئے حالی نے "نیچرل شاعری" کا تصور دیا تھا جو "سادگی، اصلیت اور جوش" کے سہ نکاتی فارمولے میں بند تھا۔ بعد میں کاشف الحقائق از امداد امام اثر اور ہماری شاعری از مسعود حسن رضوی ادیب میں اگرچہ ان بنیادوں کو رد کرنے کی کوشش کی گئی، جن کی بنا پر اردو شاعری کو "غیر فطری" قرار دیا گیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ آزاد اور حالی کے شعری معیارات نے ہمارے روایتی شعری تصورات پر جو شب خون مارا، اس سے بعد میں وہ کبھی جانبر نہ ہو سکی تھی۔

1857ء کے بعد ہماری اجتماعی زندگی کو احساس شکست سے نکالنے اور قوم کو نیا عزم دینے کے لیے جن لوگوں نے نہایت معنی خیز کوششیں کیں ان میں ایک طرف طبقہ علماء تھا اور دوسری طرف جدید طرز

تعلیم کے پروردہ واذہان۔ ہر دو کی کاوشیں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بے مثال تھیں، لیکن جدید اور موجودہ تحریکات کے مفہوم میں علی گڑھ تحریک اپنی عقلیت، مقصدیت اور افادیت پسندانہ معیارات کے اعتبار سے بے مثال تھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اردو ادب میں جس رجحان یا تحریک کو ادب لطیف، جمال پرستی یا رومانویت کہا جاتا ہے اور جو عقلیت کے بجائے جذبے اور افادیت کے بجائے تخیل پر اپنی بنیاد رکھتی ہے، اسے سب سے زیادہ کمک علی گڑھ والوں ہی سے ملی تھی جو بجا طور پر ان کی چوہیں عقلیت کے خلاف ایک ردعمل تھا۔(51)

عسکری کی ادبی زندگی کا آغاز 1939ء میں ہوا تھا۔ ان کی ذہنی نشو ونما اردو دنیا کی جمال پرستانہ فضا کے ردعمل میں مخالف خطوط پر ہوئی تھی، جس کا زمانہ 30-1901ء کے مابین ہے۔ اردو کی رومانوی جمال پرستی کے امتیازی خطوط کا اظہار سب سے زیادہ نیاز فتح پوری اور اس گروہ کے دیگر ارکان کی تحریروں میں ہوا تھا۔ ان لوگوں نے جذبات پرستی اور ماورائی حسن کی تلاش میں رومان اور حسن کو سماجی پس منظر سے الگ کر کے خیالی دنیا سجانے کا ایک ذریعہ بنا دیا اور اردو نثر کو بھی روزمرہ کے الفاظ اور لب ولہجے کی قوت سے عاری کر کے اچھا خاصا خیالستان آباد کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں کچھ بین الاقوامی، سماجی، اقتصادی حالات اور کچھ نئی تعلیم کی راہ سے آنے والے ادبی تصورات مثلاً سماجی واشتراکی حقیقت نگاری کے تحت ہندوستان میں ایک طرف ادب کے ذریعے معاشرے کی تبدیلی کا احساس پیدا ہو رہا تھا تو دوسری طرف انفرادی و باطنی تجربے، خواب و وجدان، انسان کے اندر کی بہیمیت اور جنس و لاشعور کی دنیا کو بھی "حقیقت" ہی کی ایک جہت سمجھنے والی نفسیاتی حقیقت نگاری کا رجحان جنم لے رہا تھا۔ ہمارے ہاں بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں جس شے کو "نیا ادب" کہا جاتا تھا اور جو آگے چل کر "ترقی پسندی" اور "جدیدیت" میں منقسم ہو گیا، وہ ایک اعتبار سے ادب لطیف، جمال پرستی اور نیاز فتح پوری گروپ کے رومانوی تصورات اور اسلوب نثر کے خلاف ردعمل تھا، جسے بہت تیزی سے فروغ حاصل ہوا۔ اس کے بڑے نمائندوں میں ایک طرف میراجی، ن م راشد اور منٹو تھے تو دوسری طرف اختر حسین رائے پوری، پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر اور وہ تمام اہم لکھنے والے تھے جن سے ہمارا جدید ادب عبارت ہے۔ عسکری کے شروعاتی ادبی اور تنقیدی رجحانات نے اسی ماحول میں فروغ پایا تھا۔ وہ "نئے ادب" (جس میں ابتداً "جدیدیت" اور "ترقی پسندی" میں کوئی تفریق نہیں تھی) کے اس کارنامے کے زبردست مداح تھے کہ اس نے اپنے معاشرتی و سماجی سروکاروں اور اپنے اسلوب نثر و بیان کے طریقوں کے اعتبار سے خواہ مخواہ کی جذبات پرستی اور غیر حقیقی خیالی دنیا میں مگن رہنے والی رومانویت کے برعکس ایک طرف اردو کے پرانے، حقیقی نثری اسلوب سے اپنا رشتہ جوڑا ہے اور دوسری طرف عام لوگوں اور معاشرے کے مسائل کو ادب کا موضوع بنایا ہے۔

عسکری جب تنقید کی طرف آئے تو ایک رجحان ساز افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا نام پورے ہندوستان کی ادبی دنیا میں گونج رہا تھا۔ ان کے معروف افسانے "کالج سے گھر تک"، "حرام جادی" اور "چائے کی پیالی" فکشن کی جس تکنیک "شعور کی رو" میں لکھے گئے ہیں، اس کے بارے میں ممتاز شیریں کا کہنا ہے کہ اردو میں اس کی بنیاد عسکری ہی نے ڈالی تھی۔(52) ان کے تخلیقی سفر کا عرصہ بہت مختصر، یعنی 40-1939ء سے لیکر 1947ء تک صرف سات برس ہے۔ مگر اپنی جدت طرازی اور پختہ فنی شعور کی وجہ سے ان کا شمار آج تک طرح دار افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی تو انہیں غلام عباس سے بھی زیادہ اچھا افسانہ نگار مانتے ہیں۔(53) اپنے موضوعات کے نئے پن، کرداروں کی پیچیدگی، مخصوص زبان اور نکھی ہوئی نثر کے اعتبار سے عسکری نہ صرف اپنے دور میں بلکہ آج بھی ایک منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف "نئے ادب" کے اس اہم کارنامے کے قائل تھے کہ اس نے معنوی اور اسلوبی سطح پر خود کو معاصر زندگی اور اس کی حسیت سے جوڑا ہے بلکہ وہ خود اس ادب کے اولین معماروں اور اصول سازوں میں سے تھے۔

ہندوستان کا یہ نیا ادب آگے چل کر جلد ہی "ترقی پسندی" اور "جدیدیت" میں تقسیم ہو گیا تھا۔ سماجی حقیقت نگاری کے قائل گروہ پر مخصوص اشتراکی و روسی نظریات کا غلبہ ہو جانے کی وجہ سے ان کے اندر ادب کو بطور آلہ تبدیلی اور انقلاب سمجھنے کا رجحان غالب ہوتا گیا؛ اور دوسری طرف ادب وفن کی ماہیت اور طریق کار کے حوالے سے فنی و جمالیاتی اقدار پر زور دینے اور خود کو چند مخصوص مارکسی و اشتراکی تصورات کا پابند نہ سمجھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا ایک الگ طبقہ وجود میں آ گیا، جو فنی سطح پر ہیئت، اسلوب اور ابہام کی برتری کے قائل تھے اور موضوع اور رویے کی سطح پر داخلیت، جنس، تحت الشعور، خواب اور ذاتی و انفرادی تجربات کو بطور خاص برت رہے تھے۔ ترقی پسندوں کی طرف سے ان لوگوں کو سماجی ذمہ داری سے فراری، مزاجی، انحطاطی، قنوطیت زدہ، مریض، فحش نگار اور فرائیڈ، لارنس، ایلیٹ اور فرانسیسی زوال پسندوں کے پیروکار کہا جاتا تھا۔ عسکری بھی آگے چل کر اگرچہ اسی دوسرے گروہ میں شمار کیے گئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا ادبی نقطۂ نظر بعض اعتبارات سے ان دونوں گروہوں کے قریب بھی تھا اور ان سے مختلف اور ممتاز بھی۔ یہیں ان کے انفرادی طرزِ فکر کی پہلی شناخت ہوتی ہے۔

عسکری کے باقاعدہ تنقیدی سفر کا آغاز تو "جھلکیاں"، 1944ء سے ہوا مگر جزیرے کے اختتامیے، 1943ء ہی میں جہاں وہ خود اپنے افسانوں سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں وہاں انہوں نے اس وقت کے نئے ادبی شعور کی کمزوریوں کی طرف بے لاگ اشارے کر کے نئی راہیں بھی سجھائی تھیں: مثلاً زندگی اور ادب میں محض انکار کے بجائے اثبات کی اہمیت، اردو ادب کے روایتی دھاروں سے واقفیت کی ضرورت۔ نئے ادب کے غالب عنصر اور ذہنی ماحول کے بیشتر فیصد مغربی ہونے، نظام

زندگی میں انفعالیت آجانے اور وجود کی مرکزیت غارت ہو چکنے کا احساس دلا کر ان کا کہنا تھا کہ اگر اردو ادیب اسی روش پر قائم رہے تو ہم زیادہ سے زیادہ مغربی ادب کا مشرقی ایڈیشن ہی کر سکیں گے۔ لہٰذا اس سے مختلف ہونے کے لیے کچھ ہمہ گیر اخلاقی اقدار اور روحانی تجربوں کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ مغرب جو خود ایک نئے شعور کے لیے مضطرب ہے اسے "اگر یہ نیا شعور کوئی فراہم کر سکتا ہے تو چین یا ہندوستان"۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عسکری کے اندر اس احساس نے جڑ پکڑ لی تھی کہ اردو ادب کو موجودہ مقام سے آگے بڑھانے کے لیے

"تخلیقی جوہر کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ایک پُر از معلومات اور جاندار تنقید کی"،

لہٰذا انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا تھا:

"اس مسئلے میں میری دو رائیں نہیں ہیں کہ اب اردو ادب کو تخلیق سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے۔"

("اختساب"، جزیرے، ص 181)

اس کے بعد وہ بتدریج تخلیق سے زیادہ تنقید کی طرف مائل ہوتے گئے۔ ان امور کو ان رجحانات کا نقطہ آغاز سمجھنا چاہیے جن کا اختتام روایت کے تصور پر ہوا تھا۔ اس دوران انہوں نے بہت سے تصورات اختیار کیے اور چھوڑے مگر اردو کے جدید تنقیدی منظر نامے میں "پُر از معلومات اور جاندار تنقید" کے جو نقوش انہوں نے مرتسم کیے انہیں باریک بینی سے دیکھتے ہوئے عسکری کے "تضادات" اور "بار بار آراء بدلنے" کے تاثر کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ یہ تنقیدی شعور اردو میں سوائے ان کے کسی اور کو حاصل نہیں تھا اور اسی کی بدولت آخر وہ خود جس مقام پر پہنچے تھے اس میں اور ان کے نقطہ آغاز میں حیرت انگیز وحدت اور توافق موجود ہے۔

عسکری کے ابتدائی خیالات میں اگرچہ ترقی پسندی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں مگر انہوں نے ترقی پسندوں کے نظریہ ادب اور فن کے طریقہ کار کے بارے میں ان کے خیالات پر سخت ترین تنقید یں لکھی تھیں اور اپنے سر انحطاطی و فراری اور اسلوب و ہیئت پرستی کا الزام بھی لے لیا تھا مگر ان کی تحریریں بتاتی ہیں کہ حقیقت اسے کے برعکس ہے۔ ادب اور زندگی کے اٹوٹ رشتے کے وہ اتنے زبردست قائل تھے کہ بالکل آغاز ہی میں انہوں نے یہ سطور لکھ کر اپنے ادبی نظریے کا اعلان کر دیا تھا:

"میری طرف سے مجھے اندیشہ ہے یہ شبہ پیدا ہونے لگا ہے کہ میں آرٹ کو زندگی سے الگ سمجھتا ہوں۔ لیکن آرٹ اور زندگی کا تعلق تو اتنی ابتدائی اور بنیادی۔۔۔ اس لیے مبتدیانہ۔۔۔ چیز ہے کہ بار بار اسے دہراتے رہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ صفحے صرف لفظوں کی تراش خراش اور نوک پلک تک محدود نہیں

رہ سکتے۔ زندگی ان میں دروازے توڑ توڑ کر گھستی رہے گی۔ تاہم یہ کہے بغیر
آگے نہیں بڑھ سکتا کہ مادہ آرٹ کے لیے ضروری سہی، لیکن اس پر آرٹ کا عمل
ہو چکنے کے بعد وہ مادہ نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے۔''

(''جھلکیاں'' ۱۹۴۳ء مشمولہ جھلکیاں، ص ۲)

اس اقتباس میں ان کا وہ تصور ادب پوری طرح بند ہے جو ایک طرف ادب اور زندگی کو ایک اکائی کے طور پر دیکھتا ہے اور دوسری طرف محض چند مخصوص اشتراکی تصورات و موضوعات کو ان گھڑ طریقے سے بیان کردینے کو نا کافی سمجھتا ہے۔ اس تصور ادب کی بدولت ہی ان کا راستہ ایک طرف ''خالص ادب و فن'' اور محض لفظوں کی تراش خراش پر جان دینے والے ادب برائے ادب کے شیدائیوں سے جدا ہو جاتا ہے تو دوسری طرف ''آرٹ کے عمل'' کی اہمیت نہ سمجھنے والے ترقی پسندوں سے الگ ہے۔ وہ اگر چہ فرانسیسی زوال پسندوں کے زیر اثر ہیئت اور اسلوب کی برتری کے بھی قائل تھے (جھلکیاں کی تحریروں میں اس رجحان کا غلبہ صاف دکھائی دیتا ہے) مگر سماجی، ثقافتی اور تاریخی موثرات حیات کو بھی غیر اہم نہ سمجھتے تھے اور ادب اور زندگی کے ان مظاہر کے مابین گہرا تعلق محسوس کرتے تھے۔

1946-47ء کے دور میں انہوں نے اپنے فرانسیسی سورماؤں بودیلئیر، راں بو، میلارمے اور والیری وغیرہ پر بھی تنقیدی نظر ڈالی تھی اور ان کے ہاں فن، ہیئت اور اسلوب کے پردے میں زندگی، اقدار اور اخلاق کی نئی معنویت کی تخلیق کا سراغ لگایا تھا۔ ان کے پہلے تنقیدی مجموعے انسان اور آدمی کے مضامین خصوصاً ''ہیئت اور نیرنگ نظر'' اور ''فن برائے فن'' میں عسکری کی اس تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے اندر فن کو ایک طرز حیات بنا کر نئی معنویتوں کی تخلیق کا ذریعہ بنانے کے لیے تھی۔ اردو تنقید میں یہ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو صرف انہی سے مخصوص ہے۔ اس پس منظر میں ان کا 1944ء کا یہ اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا:

''ادب میں دو قسم کے جعل ساز ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو فنی پہلوؤں کو غیر ضروری سمجھ کر صرف روحانیت یا خیالات کے بھروسے پر شاعری کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو صرف ایک خوبصورت سا ڈھانچہ بنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ دوسرا گروہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، اور پہلا آرٹ کو۔''

(جھلکیاں، ص ۹۳)

ترقی پسندی کے زمانۂ عروج میں ہمارے ہاں ''ادب برائے زندگی'' اور ''ادب برائے ادب'' کی بحثیں زوروں پر تھیں۔ ترقی پسند پہلے نقطۂ نظر کے قائل تھے اور جدیدیت پسندوں یا حلقہ ارباب ذوق کو دوسرے زمرے میں رکھا جاتا تھا۔ میراجی، منٹو، عسکری اور راشد وغیرہ کا شمار بھی انہی میں کیا جاتا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے زندگی، اخلاق اور روحانی اقدار سے ادب کے زبردست تعلق کے قائل ہونے کی وجہ سے وہ "ادب برائے ادب" کے ہرگز قائل نہیں ہو سکتے تھے۔ درجہ بالا اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پوری طرح نہ تو خود کو نقصان پہنچانے والوں (ادب برائے ادب) کے قائل تھے اور نہ آرٹ کو غیر اہم جاننے والوں (ترقی پسندوں) کے ساتھ تھے۔ ان کی دونوں سے لڑائی تھی اور بعض حدود میں دونوں سے اتفاق۔ وہ فن یا ادب کو جذبے کی جمالیاتی تجسیم کہتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ کسی اخلاقی معنویت اور حیات وکائنات کے کسی تصور کے بغیر فن ایک خوبصورت مگر بے جان ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ کسی فن پارے کے قرار واقعی فن ہونے کے لیے جمالیاتی اور اس کے عظیم فن ہونے کے لیے غیر جمالیاتی معیاروں پر اصرار کرتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد عسکری کا بڑا کارنامہ پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کی ضرورت اور اس کے خدوخال متعین کرنے کی بحثیں اٹھانا ہے۔ اس میں اگر چہ وہ تنہا نہیں تھے مگر ادیب برادری میں سب سے توانا آواز انہی کی تھی۔ پاکستانی کلچر کی تشکیل کے حوالے سے ان کا اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ اصل شے ہند اسلامی کلچر کی وہ انفرادیت ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے صدیوں کے تخلیقی عمل سے وجود پذیر ہوئی تھی۔ اسی کے سیاسی حصار کے طور پر پاکستان وجود میں آیا ہے۔ مسلم کلچر روح اور پاکستان اس کا قالب ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان کوئی نئی شے نہیں بلکہ مسلمانان برصغیر کے صدیوں پرانے شعور کا سیاسی لازمہ ہے۔ انہوں نے یہ تصور بعض ان ترقی پسند عناصر کے ردعمل میں دیا تھا جو یہاں کے مقامی دراوڑی، ہڑپائی اور موہنجوڈرائی کلچر کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ دوسری طرف ان کا یہ نقطۂ نظر بعض ان اسلامی جماعتوں سے بھی مختلف تھا جو محض "پرانے اور خالص" اسلام کے نام پر مسلمانوں کی پچھلی ساری تاریخ اور برصغیر میں ملت اسلامیہ کے تہذیبی وتخلیقی سفر کے زائیدہ کلچر اور تمدنی وادبی اوضاع، علمی روایتوں، تعمیرات، شاعری وموسیقی اور جمالیاتی روح سے غفلت کا تاثر دیتی تھیں۔ عسکری کے نزدیک پاکستان کو اسلام کی خالص شکل کے ساتھ ساتھ ان تہذیبی نمونوں کا بھی امین بننا تھا۔ (54)

اس حوالے سے ان کی مختلف تحریروں میں درج ذیل چار نکات ملتے ہیں جن پر پاکستانی کلچر کی تشکیل ہوسکتی تھی: (الف) اسلام کے وہ بنیادی اعتقادات اور تصورات جن کے بغیر مسلمان ہونے کا کوئی مطلب نہیں پاکستانی کلچر کا لازمی جز ہوں گے۔ لیکن اس کے لیے دوسرے مسلمان ملکوں کے لباس، زبان اور وہ عناصر جنکا تعلق ان کی مقامی روایات سے ہے، انہیں اختیار کرنا لازمی نہیں۔ البتہ ان کے بہترین اور صالح عناصر اپنی ضرورت اور افادیت کے تحت قبول بھی کیے جا سکتے ہیں۔ مسلم تہذیب کے مہتم بالشان فنی مظاہر جیسے الحمرا، تاج محل، الف لیلیٰ وطلسم ہوشربا اور امیر خسرو وحافظ وغیرہ بے شک پاکستانی کلچر وادب کا حصہ ہیں۔

(ب) اسی طرح وہ اسلامی کلچر، جس نے دہلی کے مسلمان بادشاہوں کے زیر سایہ نشو ونما پائی، جس کے بڑے نمونے ہندوستان میں مسلم فن تعمیر، اردو زبان اور ادب وشعر ہیں، پاکستان کا مرکزی وقومی کلچر ہوگا۔ کیونکہ یہ علامتی طور پر مسلمانوں کے تاریخی ومعیاری آثار کا نمائندہ ہے۔

(ج) موجودہ پاکستان کے جغرافیائی خطوں اور مقامی روایتوں کا کلچر بھی اسی کلچر کا حصہ ہوگا۔ اس کلچر کا حصہ اگر پہلے مرکزی کلچر کی تعمیر میں کم تھا تو اب زیادہ ہوگا۔ ان علاقوں کے لوگ اردو کو ثقافتی ذریعہ اظہار مان کر یہ خدمت پہلے بھی کرتے رہے ہیں اور اب مزید کریں گے۔ قومی اور مقامی کلچر کا یہ توازن جس میں مقامی کلچروں کی انفرادیت بھی ہے اور قومی کلچر کا استحکام بھی، ہند اسلامی تہذیب کی وہ وراثت ہے جس کے تحفظ کی خاطر پاکستان وجود میں آیا ہے۔

(د) آخری درجے میں دوسرے ممالک اور اقوام کے علوم وفنون، شعر وادب اور روایات واقدار سے بھی پاکستانی کلچر کو استفادہ کرنا ہوگا کیونکہ دنیا میں زندہ رہنے اور اپنے بامعنی وجود کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔

پاکستانی کلچر کے بارے میں عسکری کے ان خیالات، بالخصوص ہند اسلامی کلچر کو مرکزی کلچر بنانے کی تجویز پر اعتراضات بھی بہت ہوئے اور انہوں نے خود بھی اس کا جواب دیا تھا۔ اس حوالے سے اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ ان معدودے چند ادیبوں میں سے تھے جنہوں نے مسلمانان پاک و ہند کے انفرادی شعور و کلچر پر غور وخوض کا کام پاکستان بننے سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا اور قیام پاکستان کے بعد پاکستانی کلچر کے خدوخال وضع کرنے اور اس طرح کی بحثوں کے عام کرنے میں نہایت موثر کردار ادا کیا تھا اور مذہب کو کلچر کا ایک فاعلی وموثر عنصر قرار دینے کی آواز نہایت شدت سے بلند کی تھی۔ اسی ضمن میں انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے نمونوں پر مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا تھا جس کا مقصد اس کلچر میں ذوق تعمیر کی اہمیت اور مٹی گارے سے بنی ہوئی عمارات میں مادی فطرت سے اوپر اٹھنے کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ (55)

عسکری کے ادبی وتنقیدی تصورات کی غلط تفہیم کی وجہ سے ان پر فراری، داخلیت پسند، زندگی سے گریزاں اور زوال پسند انحطاطی ہونے کا الزام اکثر لگتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے انفرادی و اجتماعی زندگی، تاریخی شعور، تہذیب وکلچر اور اپنے زمانے کے کسی بھی مسئلے کا دروازہ اپنے اوپر کبھی بند نہیں کیا تھا: بلکہ انہیں تو اپنے بعض ادیب ساتھیوں پر اعتراض ہی یہ تھا کہ انہوں نے خود کو اپنے زمانے کے اہم ترین مسائل اور بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے قومی شعور سے بیگانہ کیوں کر رکھا ہے۔ اس حوالے سے ان کی تنقیدات کا ہدف ترقی پسند حلقے بھی تھے اور ان سے الگ سوچ رکھنے والے وہ جدیدیت پسند اور حلقہ ارباب ذوق والے ساتھی بھی جنہیں عرف عام میں جنس، تحت شعور لاشعور اور ذاتی الجھنوں سے

دلچسپی رکھنے والے مریضانہ ذہنیت کے لوگ کہا جاتا تھا۔ ترقی پسندوں سے ان کا اختلاف اس بنا پر تھا کہ یہ لوگ ساری دنیا کا درد اپنے سینے میں رکھتے ہیں مگر برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست اور کلچر سے اس لیے کوئی تعلق نہیں رکھتے کہ ان پر کہیں فرقہ پرستی کا الزام نہ آ جائے۔ حلقہ ارباب ذوق اور جدیدیت والوں سے انہیں اس لیے اختلاف تھا کہ یہ لوگ اگرچہ مسلمان طرز سیاست، ملی شعور اور کلچر کو برا نہیں سمجھتے مگر ایک ادیب کے طور پر اپنے تخلیق کردہ ادب میں ان مسائل کی پرچھائیں نہیں پڑنے دینا چاہتے، اپنے تئیں ایک ''خالص ادب'' کے تصور پر فدا ہیں اور ترقی پسندوں کے برعکس ادب میں کسی نظریہ بازی کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتے۔ قیام پاکستان کو عسکری مسلمانوں کی ملی تاریخ میں ایک بہت بڑا تخلیقی تجربہ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس عظیم الشان تجربے کا تخلیقی ادب اور جمالیاتی فنون میں بھی اظہار ہونا چاہیے اور اہل دانش طبقے کو بے حسی کے اس احساس سے باہر آ جانا چاہیے جو انہوں نے خود پر طاری کر رکھا ہے۔ (56)

عسکری کا تصور ادب ان دونوں گروہوں کے تصورات کے بین بین تھا۔ ترقی پسندوں کی اس کاوش کے تو وہ قائل تھے کہ انہوں نے ادب کو اپنے زمانے کے زندہ مسائل اور سماج و سیاست سے جوڑ دیا ہے۔ مگر ان کے برعکس وہ خود برصغیر کے مسلمانوں کی ملی آرزوؤں اور مذہبی آدرشوں کو بھی ادب کا مسئلہ بنانا چاہتے تھے۔ ادب برائے ادب یا حلقہ ارباب ذوق والوں سے عسکری اس امر میں متفق تھے کہ ادب وفن کو سب سے پہلے فنی و جمالیاتی معیاروں پر پورا اترنا چاہیے، لیکن یہ لوگ جس طرح ادب پر کسی نظریے کی پرچھائیں نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے، اس سے عسکری کو مذکورہ بالا وجہ سے اعتراض تھا۔

عسکری نے جس طرح پاکستانی کلچر پر بحثیں اٹھائی تھیں اسی طرح پاکستانی ادب کے خدوخال متعین کرنے میں بھی ان کی آرا سب سے منفرد تھیں۔ ان کے نزدیک اردو زبان اور ادب و شاعری کی پوری تاریخ فرد کے ذاتی مطالبات کو اجتماعی شعور سے ہم آہنگ کرنے اور داخلیت و خارجیت میں توازن پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ دنیاویت، روحانیت اور انفرادیت و اجتماعیت کے مابین توازن کی اسی تلاش کو وہ اردو کی مرکزی روایت کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے قیام سے ہمارے اندر جو نیا تخلیقی وفور پیدا ہوا ہے اس سے کام لیکر ہمیں روایت اور تجربے کے تال میل سے ایک نئی بوباس والے ادب کی داغ بیل ڈالنی چاہیے۔ یہ گویا عسکری کی طرف سے ''پاکستانی ادب'' کی ضرورت کے اولین اشارے تھے مگر اس کے لیے انہوں نے ''پاکستانی ادب'' کی اصطلاح ابھی استعمال نہیں کی تھی۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون ''ادبی روایت اور نئے ادیب'' (مشمولہ تخلیقی ادب اور اسلوب) میں اس پس منظر میں کیا جب پاکستان بننے کے بعد کچھ نئے غزل گوؤں مثلاً ناصر کاظمی وغیرہ میں انہیں اجتماعی تجربے کو گرفت میں لینے والی اردو کی پرانی روایت زندہ ہوتی نظر آئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ماضی میں بھی غزل

اجتماعی زندگی کے اظہار کا بہترین ذریعہ تھی اور اب ہجرت اور فسادات کے تجربے کو بھی سب سے پہلے اس نے اسی اجتماعی زندگی کو گرفت میں لینے والی روایت میں گھول دیا ہے۔ یہی وہ نئے تجربے تھے جس میں "پاکستانی ادب" کے ابتدائی خدوخال تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

"پاکستانی ادب" کی اصطلاح سب سے پہلے ہمیں ان کی دو تحریروں بہ عنوان "پاکستانی ادب" اور "پاکستانی قوم، ادب اور ادیب"، 1949ء (مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب) میں نظر آتی ہے۔ پھر ذرا بدلے ہوئے حالات میں انہوں نے اس مسئلے پر اپنے مضمون "پاکستان میں ادب کا مستقبل" (مشمولہ مقالات عسکری، ج1) میں بحث کی تھی۔ اس میں ان کا تخاطب یوں تو تمام اہل دانش سے تھا مگر خصوصاً ترقی پسندوں، حلقہ ارباب ذوق والوں اور تیسری طرف کچھ مذہبی جماعتوں کے ادبی حلقوں سے بھی تھا۔ ترقی پسندوں کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کو پاکستانی ادب سے اختلاف اصل میں تقسیم کے اس تصور کی وجہ سے ہے جسے وہ انگریزوں اور سرمایہ داروں کی ایک چال سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ اپنے احساس شکست سے باہر نکلیں اور قوم کی امنگوں کا ساتھ دیں۔ حلقہ ارباب ذوق یا ادب برائے ادب والوں سے عسکری کا کہنا تھا کہ پاکستانی ادب کا مطلب قصیدہ خوانی یا سیاست بازی نہیں بلکہ یہ انہی معنوں میں اسلامی ادب ہوگا جن معنوں میں رومی، حافظ، میر اور اقبال کا کلام اور جن معنوں میں الحمرا اور تاج محل اسلامی فن تعمیر کے نمونے ہیں۔ ان لوگوں کے "خالص ادب و فن" کے تصور پر تنقید کرتے ہوئے عسکری نے لکھا تھا کہ جب تک اپنے ملک و قوم کے جذباتی اور اجتماعی مسائل ادیب کی شخصیت کا قوی عنصر نہیں بنتے محض 'کوری ادبیت' سے بڑا ادب پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے وہ "غیر جمالیاتی اقدار" بھی ضروری ہیں جو ایک تہذیب انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا کرنے کے لیے اس پر عائد کرتی ہے:

> "ادب صرف اتنا ہی کام کر کے نہیں رہ جاتا کہ جماعت جیسی کچھ بھی ہے اسکی عکاسی کردے۔ جماعت کی شخصیت میں نشونما کے جتنے امکانات ہوتے ہیں ان کا اندازہ اور تجربہ وہ پہلے ادب اور فن ہی کے ذریعے کرتی ہے۔ تو جب تک ادب یہ سارے مطالبات پورے نہ کرے جماعت کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا، خواہ وہ کتنا ہی 'خالص' یا کتنا ہی 'ترقی پسند' کیوں نہ ہو۔"

(تخلیقی عمل اور اسلوب، ص ۵۹)

کچھ مذہبی حلقوں کے "اسلامی ادب" کے تصور پر بات کرتے ہوئے عسکری نے لکھا تھا کہ ادب و آرٹ کا مطلب نہایت کھلے لفظوں اور محدود معنی میں اخلاق کی درستی اور موعظت حسنہ کا پیغام نہیں ہوتا بلکہ آرٹ کا طریق کار ان اصولوں کو سمجھنے سے پتہ چلتا ہے جن کی وجہ سے مثلاً تاج محل اور اسلامی فن تعمیر

کے دیگر نمونوں میں فطرت کے مادی اصولوں سے اوپر اٹھنے کی روح پیدا ہوتی ہے۔ ادب و آرٹ کی نوعیت اور طریق کار پر ایک طویل بحث کر کے انہوں نے لکھا تھا:

"میرے ذہن میں جس پاکستانی یا اسلامی ادب کا تصور ہے وہ ڈرا سہما یا تنگ دل یا کٹ حجت نہیں ہوگا بلکہ دلیر، بے باک، حساس، نئے تجربوں کا شوقین، ہر قسم کی ذہنی اور اخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنے کو تیار۔ کیونکہ اسلامی کردار یا اسلامی سماج کی تخلیق فنکار کے شعور کی خوفناک روشنی کے بغیر ممکن نہیں۔"

(تخلیقی عمل اور اسلوب، ص ۶۷)

ان کے نزدیک پاکستانی ادب کا فریضہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اسلام کے اصولوں کو نظم اور افسانوں میں پیش کرتا رہے، خواہ ادیب کو ان کی سچائی کا جذباتی تجربہ ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کا مقصد اس کشمکش کا اظہار بھی ہے جو ان اصولوں کو اپنی شخصیت کا حصہ بنانے میں فنکار کو درپیش ہوتی ہیں۔ پاکستانی ادب کی سب سے بڑی خصوصیت عسکری کے نزدیک یہ ہونی چاہیے کہ اس میں جھوٹ اور ریاکاری نہ ہو، وہ محتسب کا کوزا نہ ہو بلکہ خود احتسابی کا عمل۔ اسی معنی میں انہوں نے ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیار پوری جیسے چند شعرا اور سعادت حسن منٹو و قدرت اللہ شہاب کی کہانیوں "کھول دو" اور "یا خدا" کو پاکستانی ادب کے نمونے قرار دیا تھا۔

"ہمیں خوشی ہے کہ پاکستانی ادب خود پاکستانیوں پر تنقید سے شروع ہوا ہے۔ اگر پاکستانی ادیب واقعی اسی انداز سے پاکستان کے خلاف لکھنا شروع کر دیں تو پاکستان کا مستقبل محفوظ ہے۔"

(مقالات عسکری، ج1، ص92)

اور منٹو کا بطور خاص ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"منٹو کی تحریروں میں جس قسم کی سچائی، سادگی، اخلاقی معیاروں کا شدید احساس، صداقت کی طلب، صاف گوئی ملتی ہے میں تو اسی کو اسلامی ادب سمجھتا ہوں۔"

(مقالات عسکری ص94 ,92)

یہاں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ عسکری کے نزدیک "اسلامی ادب" اور "پاکستانی ادب" میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ وہ بعد میں پاکستانی ادب سے دستبردار ہو گئے تھے۔ کیونکہ 1954ء میں انہوں نے پاکستانی ادب سے متعلق اپنے مضامین کی کتاب بھی ترتیب دے لی تھی۔(57)

اسلامی اور پاکستانی ادب کے مسئلے پر عسکری کے ان خیالات کی وجہ سے اس زمانے میں یہ سوال اکثر اٹھایا گیا تھا کہ اب اگر وہ ایک "مقصدی ادب" کی بات کرتے ہیں تو اس سے قبل وہ ترقی پسندوں کے نظریہ ادب اور اس کے تحت پیدا ہونے والے فسادات کے ادب سے اختلاف کیوں کرتے رہے ہیں؟ یا یہ کہ پاکستان بننے کے بعد عسکری کے خیالات میں "عظیم تبدیلی" واقع ہو گئی تھی۔ عسکری کے خیالات میں وقتاً فوقتاً ہونے والی تبدیلی کے مظہر سے انکار کیے بغیر یوں کہا جا سکتا ہے انہیں نظریاتی ادب سے شاید اتنا اختلاف نہیں تھا جتنا نظریے کو ادب پر حاوی کرنے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ادب کی فنی و انسانی معنویت سے صرف نظر کرنے سے۔ جن بنیادوں پر انہیں فسادات کے ادب پر اعتراض تھا انہی بنیادوں پر بعض لوگوں کے "اسلامی ادب" کے تصور سے بھی خدشات ظاہر کیے تھے۔ انہی معنی میں انہوں نے لکھا تھا: "ادب میں دو قسم کے جعل ساز ہوتے ہیں۔۔۔" (اقتباس پیچھے گزر چکا ہے) لہٰذا وہ آرٹ کو نقصان پہنچانے والوں (خواہ وہ ترقی پسند ہوں یا اسلامی ادب والے) سے زیادہ نالاں تھے۔ لیکن 1944ء کے ایک مضمون میں جہاں انہوں نے ایزرا پاؤنڈ کے حوالے سے لکھا تھا کہ "شاعر تو خطرے کی گھنٹی ہے وہ آپ کو آگاہ کر سکتا ہے کہ آگ لگ رہی ہے لیکن اسے آپ آگ بجھانے والا انجن بننے پر مجبور نہیں کر سکتے" اسی میں آگے چل کے یہ بھی لکھا تھا:

> "پراپیگنڈا ابھی کوئی ہوّا بھی نہیں کہ شاعری کو فوراً نگل ہی لے گا۔ حالانکہ میں ترقی پسندوں سے اکثر جھگڑتا رہا ہوں لیکن جب تک ہم پرچاری شاعری کو دنیا کی سب سے بڑی شاعری نہیں کہنے لگتے میں پروپیگنڈے سے بالکل نہیں گھبراتا۔"

("نئی شاعری"، مئی 1944ء، جھلکیاں، ص ۹۷)

یہ عسکری کے 1944ء کے خیالات ہیں جب وہ ترقی پسندوں کے خلاف شمشیر برہنہ تو تھے مگر ابھی "پاکستانی پرچاری ادب" کا کوئی سوال نہ تھا۔ تقسیم کے بعد جب وہ "مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی"، "ادب اور انقلاب" اور "فسادات اور ہمارا ادب" (مشمولہ انسان اور آدمی) لکھ کر ترقی پسندوں سے اختلاف کر رہے تھے تو درج بالا خیالات ہی کی روشنی میں کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آرٹ کا مواد اگرچہ زندگی ہی سے آتا ہے مگر ہر وقوع پذیر ہونے والا واقعہ لازماً ادب کا موضوع نہیں بن سکتا۔ واقعہ بطور واقعہ کے ادب بن ہی نہیں سکتا بلکہ اس کے ذریعے وجود میں آنے والی انسانی معنویت ادب کا موضوع بنتی ہے۔ اس طرح وہ "ادب کی مقصدیت" کے بھی قائل تھے مگر "جذباتیت" کے نہیں۔ وہ ادب و فن کے بارے میں جذبات کے اظہار والے نظریے کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ فن کو جذبوں، مفادوں اور جبلتوں کی تنظیم و تجسیم کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ فنکار کے اندر ایک غیر جانبداری، لاتعلقی اور

معروضیت ہونی چاہیے، جس کا مطلب بے رحمی، سنگ دلی اور انسانیت کی کمی نہیں بلکہ ہمدردی، رحم اور انسانیت جیسے وسیع جذبوں کو پائیدار بنیادوں پر قائم کرنا اور سچائی کا تقاضہ ہو تو اپنے خلاف بھی گواہی دینا۔(58)

فن میں اگر یہ توازن اور باہمدردی بے ہمہ دانی غیر جانبداری ہو تو اس کی مقصدیت بھی اسے نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ مضبوط انسانی معنویت قائم کرتی ہے۔ انسانی معنویت اور کسی پائیدار نظام اقدار سے رشتہ جوڑے بغیر ادب بے جان ہو جاتا ہے۔ اسی معنی میں وہ کہتے تھے:

''خالص ادب ایک مہمل اصطلاح ہے...فن کار کا مقصد و منشا صرف فن پارے کی تخلیق ہوتا ہے۔ البتہ فن کا مقصد غیر جمالیاتی بھی ہوتا ہے، جو ایک مخصوص تہذیب اس کے اوپر عائد کرتی ہے...ایزرا پاؤنڈ...(کو) ادب میں اتنی دلچسپی اور باتوں سے نہیں جتنی اسالیب بیان سے ہے، مگر اس کے باوجود انہوں نے ادب کا ایک فریضہ بالکل غیر جمالیاتی قسم کا قرار دیا ہے یعنی انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش قائم رکھنا۔ یہ فریضہ خالص ترین ادب کا بھی ہوگا۔ چونکہ انسان کی سب سے بڑی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ میں زندہ رہوں اور...ایک خالص انفرادیت اور شخصیت قائم رکھتے ہوئے زندہ رہوں۔ اس لیے ادب کے لیے یہ بھی لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک خاص ہیئت اجتماعی کی گہری سے گہری اور وسیع سے وسیع زندگی کی ترجمانی کرے، بلکہ یوں کہیے کہ تشکیل اور تجسیم کرے۔''

(تخلیقی عمل اور اسلوب، ص ۵۹)

پیچھے ہم نے دیکھا تھا کہ اپنی تمام تر ہیئت پرستی اور فلوبیئر جیسے اسلوب کے شیدوں سے اپنی رغبت کے باوجود انہوں نے فن برائے فن کے اس نظریے کو غلط قرار دیا تھا جو الفاظ کا ایک خوبصورت ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے: اس کے مقابلے میں وہ ہیئت پرستی کو زندگی اور اخلاق کی ایک نئی معنویت تخلیق کرنے کا ذریعہ جانتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے 1946-47ء ہی میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر آگے چل کر 1953ء میں انہوں نے ادب و فن کی جمالیاتی اقدار اور اس کی اخلاقی و انسانی قدر کے بارے میں اس دوٹوک خیال کا اظہار کیا کہ ادب و فن کے قرار واقعی فن ہونے کا فیصلہ تو اس کے فنی معیارات پر ہوتا ہے لیکن اس کے عظیم فن ہونے کا فیصلہ محض فنی معیارات پر نہیں بلکہ غیر فنی اقدار پر ہوتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

''کسی شعر کی عظمت کا فیصلہ محض شعری یا جمالیاتی اقدار کے اندر رہ کے نہیں ہو سکتا، لیکن کوئی شعر واقعی شعر بھی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ محض شعری

اقدار کے اندر رہ کے ہوتا ہے۔"

(تخلیقی عمل اور اسلوب، ص260)

مبادا یہ گمان ہو کہ عسکری کے اندر یہ تبدیلی قیام پاکستان کے بعد مصلحتاً آگئی تھی۔ ان کے 1946ء کے ایک مضمون "ہندوستانی ادب کی پرکھ" کو دیکھ لینا بہتر ہوگا جس میں وہ اردو کے اس کلاسیکی تنقیدی شعور کی نوعیت بیان کررہے ہیں جسے آزاد اور حالی کے بعد کی تنقید نے رد کرنا شروع کردیا تھا۔ اس میں عسکری لکھتے ہیں:

> "میر کی شاعری کو پسند کرنا اور انھیں خدائے سخن کا لقب دینا ہی بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے یہاں صرف زبان و بیان کی خوبیاں ہی قابل توجہ نہیں تھیں بلکہ اخلاقی ثقافتی اقدار بھی بڑی شاعری کے لیے لازمی سمجھی جاتی تھیں۔... بڑی شاعری کے لیے محض مراعاۃ النظیر اور مناسبت لفظی کافی نہیں، بلکہ ہم اس سے جذبات کے ایک خاص کلچر کا مطالبہ کرتے ہیں اور زندگی کے متعلق ایک سنجیدہ اور بلند نقطۂ نظر مانگتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو ہمارے تنقیدی معیار (وہ غیر شعوری ہی سہی) بڑی شاعری کے لیے چند ثقافتی اور جذباتی اقدار لازمی ٹھہراتے ہیں، دوسری طرف بیان اور اسلوب کے بھی ایسے اصول پیش کرتے ہیں جو ہر ترقی یافتہ زبان اور ادب میں رائج ملیں گے۔"

(جھلکیاں، ص ۲۷۵)

اپنے اس تصورفن کی بنیاد پر عسکری نے دو اہم کارنامے سرانجام دیے:۱) ایک طرف اردو کے پرانے تنقیدی شعور سے اپنا رشتہ جوڑ کر مابعد حالی تنقید کی اس غلط فہمی کو دور کیا کہ اردو کے پرانے شعراء کے ہاں محض لفظی تراش خراش اور عروض و بحر کے میکانکی نظام سے غرض رکھی جاتی تھی۔۲) دوسری طرف اپنے زمانے کی اس ادبی فضا میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا جہاں ایک سرے پر ترقی پسندی کے جوش میں چند مخصوص موضوعات اور مسائل کے ان گھڑ بیان اور موضوع و مافیہ کو اسلوب، ہیئت اور فن کے مقابلے میں برتر مانا جاتا تھا؛ اور دوسری طرف خالص ادب اور فن برائے فن کے حاملین و قائلین جدیدیت نے صرف فنی رموز، اسلوب و ہیئت، ابہام و تمثیل، تجریدیت و علامتیت اور موضوعیت و داخلیت ہی کو ادب کا سروکار قرار دے رکھا تھا۔ ان دو طاقتور ادبی دھاروں کے بیچ میں، انہی میں سے ہونے کے باوجود عسکری نے دونوں کی انتہا پرستی سے الگ ہوکر فن کی جمالیاتی قدر کی اہمیت کا بھی اثبات کیا اور ادب میں موضوع، مافیہ، اخلاقی و ثقافتی اقدار، تصور حیات و کائنات اور زندگی کی پائیدار قوتوں کی کارفرمائی کو بھی بہت ضروری قرار دیا۔

عسکری کے بعد کی تنقید میں آج جس مظہر کو "مابعد جدیدیت" کہا جارہا ہے وہ ایک اعتبار سے جدیدیت کی اس فارمولا بند سخت گیری کے خلاف ردعمل ہے جس میں ترقی پسندی کی طرف سے موضوع کی سربلندی کی ضد میں جدیدیت نے فن پارے کی خودمختاری کو ڈھال بنا کر ادب کا رشتہ تاریخ، تہذیب اور معاشرے سے کاٹ دیا تھا۔ مابعد جدیدیت آج ترقی پسندی اور جدیدیت کی انتہا پسندانہ روش کے خلاف توازن، کشادہ ذہنی، تنوع، جمالیاتی اقدار اور فارمولا بندی سے آزاد تخلیقیت کی نئی لہر کا علم اٹھائے ہوئے ہے۔ مگر عسکری کی تنقید اپنے زمانے میں یہی کام کسی نئی اصطلاح کا سہارا لیے بغیر کرتی رہی ہے: لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ عسکری کے ادبی تصورات اور مابعد جدیدیت ایک ہی شے ہیں۔ اس مسئلے کو چھیڑنا ایک الگ باب کا تقاضہ کرتا ہے، جو فی الحال ہمارا موضوع نہیں۔

عسکری کی تنقید کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہیں شروع ہی سے اس کا احساس تھا کہ جہاں تک شعر و فن کی جمالیاتی خوبیوں کو پرکھنے کے معیارات و آلات کا تعلق ہے اس میں مشرقی تنقید خاصی خود کفیل ہے لیکن فن کی ماہیت، تخلیقی عمل کی نوعیت، فن کار کے اندر تخلیقِ فن کے شعوری و لاشعوری محرکات، اسکے نتیجے میں تخلیق کار کو پہنچنے والی تسکین یا اذیت اور اس کے اندر ہونے والی تبدیلی یعنی جذبے کے اظہار، ارتفاع اور تنظیم کے مسائل پر چونکہ مغرب میں بہت زیادہ کام ہوا ہے، اس لیے ہمارے کلاسیکی تنقیدی شعور کو اس معاملے میں مغرب سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس پہلو کو وہ "تخلیق کی نفسیات" کہتے ہیں۔ تخلیقی عمل کے اس پہلو پر انہوں نے "ہندوستانی ادب کی پرکھ" نامی مضمون کے دور ہی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا اور نفسیات کے نئے تصورات و نظریات کو اپنی تنقید میں خاصا استعمال کیا ہے۔ مگر اس میں ان کا طریقہ کار نفسیات کی نت نئی اصطلاحوں کو موقع بے موقع استعمال کرنے کا نہیں بلکہ نئی نفسیات کے دریافتوں، شعور و لاشعور، جبلت و جنس اور جذبوں کے اظہار و تنظیم کے تصورات کی روشنی میں تخلیقی عمل اور فن کار کے باہمی تعلق پر بڑے تخلیقی انداز میں بحث کی ہے۔ اس سلسلے کی زیادہ تر بحثیں ان کے دوسرے تنقیدی مجموعے ستارہ یا بادبان میں شامل ہیں۔ مگر نفسیات سے اپنے گہرے شغف کے باوجود ان کا یہ کہنا ہے کہ ادب کی ماہیت اور اسکی فنی و جمالیاتی قدر و قیمت دو الگ الگ چیزیں ہیں اس لیے نفسیات کی روشنی میں ادب کو پڑھتے ہوئے احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔

زندگی اور ادب کے معاملات میں عسکری انفرادی نقطۂ نظر کے قائل تھے۔ اجتماعیت پرستی، حکومتوں اور جماعتوں کے اقتدار کو وہ ادب و آرٹ کے لیے شروع ہی سے بڑا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ مگر "انفرادیت پرستی" کا مطلب ان کے نزدیک "اپنی انفرادیت کے محدود ہونے کا اعتراف" تھا۔ (59) اسی لیے وہ اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل سے جڑنے پر بہت زور دیتے تھے۔ ماضی کی روایتوں سے منقطع، غیر متوازن اور کسری معاشرے میں سماج کے ذہین ترین افراد یعنی ادیب اور دانش ور طبقے کو

اپنے ملک وقوم کے اجتماعی آدرش سے جوڑنے کے لیے انہوں نے ان تھک اور مسلسل لکھا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کلچر اور پاکستانی ادب کے مباحث کے زمانے سے لیکر 57-1856 ، تک ان کی تحریروں میں ان باتوں کی مسلسل تکرار ہے۔

اس دوران انہوں نے بہت سے مسائل تجزیے اور بحثیں اٹھائیں، مثلاً ادب کا جمود و موت، ادیبوں میں تخلیقی امنگ کی کمی اور تجرباتی رنگ کا زوال، نئے محسوسات اور تجربات کو گرفت میں لینے والے نئے وسائل کا اظہار اور اسالیب بیان کی تخلیق، اردو نثر میں قلّتِ افعال اور صفات کے استعمال کا مسئلہ، محاورے اور استعارے کی بحث، اردو نثر کی محدودیت جو مغربی ادب کے ترجمے میں آڑے آتی ہے، پیروی مغربی کی ادھوری و ناتمام کوشش کا تجزیہ اور پھر ادبی مسائل سے ماورائے ادب چلے جانے کے مسائل: ان تمام مباحث میں انہیں مسلسل یہ شکوہ رہا ہے کہ لکھنے والوں کا اپنے قاری، معاشرے اور اجتماعی زندگی کے تجربے سے زندہ تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اس دوران وہ ادبی سرگرمیوں میں قاری کے کردار، اس کے تقاضوں کی اہمیت اور ان چیلنجوں کے قبول کرنے کی ضرورت کو تخلیق ادب کا ایک ضروری اور اہم ترین عنصر قرار دیتے رہے ہیں۔ ان کی اس طرح کی تحریروں میں، جواب زیادہ تر تخلیقی عمل اور اسلوب کا حصہ ہیں، عسکری کی تنقید ایک خاص مفہوم میں قاری اساس تنقید کا تاثر دیتی ہے۔ اسطرح اردو کے بہت کم نقادوں کے ہاں پڑھنے والے کی اہمیت کا وہ اثبات واظہار پایا جاتا ہے جو عسکری کے ہاں ہے۔ یہ سب دراصل ان کی انفرادیت کے مخصوص تصور اور اجتماعی زندگی کے شعور سے رشتہ جوڑنے کی اہمیت کی دلیل ہے۔

اب ہم عسکری کے تنقیدی تصور کے اس پہلو کی طرف آتے ہیں جسے ان کا ''تصور روایت'' کہا جاتا ہے۔ گذشتہ صفحات میں ان کی تنقید کے جن خدوخال کی طرف اشارہ کیا گیا اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کی ادبی تربیت پوری طرح مغربی تعلیم اور وہاں کی ادبی تحریکوں کے زیر اثر ہوئی تھی۔ وہ انگریزی ادب کے طالبعلم تھے مگر انگلستان وامریکہ کی ادبی روایت کی بہ نسبت ان کا زیادہ جھکاؤ فرانسیسی ادب اور وہاں کے فکری رجحانات کی طرف تھا۔ رومانوی تحریک کے بعد مغرب میں فطرت پرستی اور حقیقت نگاری اور اسکے بعد علامت نگاری کی جو رو چلی اس کے بڑے نمائندے فرانسیسی ادیب وشاعر ہی تھے۔ انگریزی دنیا میں انہی کے ہمنوا ایزرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ تھے۔ ان فرانسیسی علامت نگاروں کو عام طور پر انحطاطی رویوں کا حامل زوال پسند کہا جاتا ہے جو یورپ کے مادہ پرست صنعتی معاشرے اور سرمایہ دارانہ تمدن کی پروردہ اخلاقیات سے آزاد تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فن اور اخلاق میں تعلق کے قائل نہیں تھے۔ ان لوگوں کے زیر اثر مغرب میں جو نئی ادبی تحریک شروع ہوئی اسے جدیدیت کہا جاتا ہے جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے رویے اور رجحانات داخل ہوتے

رہے ہیں۔ عسکری کی ادبی تربیت اسی ذہنی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ بھی اپنی ہیئت اور اسلوب پرستی اور زوال پسندی میں خاصے بدنام تھے۔

لیکن ہم نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے ادبی کیریئر کے تقریباً شروع ہی میں اپنے محبوب فرانسیسی علامت نگاروں کی ہیئت اور اسلوب پرستی کی ایک نئی تعبیر کر کے اسے زندگی اور اخلاق کی نئی معنویت اور نظام اقدار کے ایک نئے خاکے کی تعبیر قرار دیا تھا۔ ان کے مضامین ''فن برائے فن'' اور ''ہیئت اور نیرنگ نظر'' اس اعتبار سے بہت خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں پہلی مرتبہ عسکری کی تنقیدی فکر کے اس رخ کے سراغ نظر آتے ہیں جس کی انتہا ان کا ''تصور روایت'' ہے۔ ان کی تنقید کی اس نہج سے واقف ہونے کے لیے درج بالا مضامین کے علاوہ ''انسان اور آدمی'' 1949ء، ''آدمی اور انسان'' 1956ء، اور ''محسن کاکوروی'' 1959ء اور اسکے بعد کی وہ تمام تحریریں، جواب وقت کی راگنی میں شامل ہیں اور خطوط، خصوصاً بنام شمس الرحمن فاروقی (مشمولہ مکاتیب عسکری) ضرور پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اس ضمن میں تجزیے کا ''اختتامیہ'' بھی بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

عسکری کی تمام اور خصوصاً محولہ بالا تحریروں کو تاریخی ترتیب سے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا ذہنی سفر ابتداء ہی سے کسی خاص منزل کی جانب تھا۔ شروع میں اگرچہ اس منزل کی کوئی واضح اور متعین صورت ان کے ذہن میں نہیں تھی مگر گردوپیش کی اردو کی دنیا اور 15 ویں و 16 ویں صدی سے لیکر معاصر مغربی فکر و ادب تک کے مختلف رجحانات اور سرگرمیوں سے ان کی بے اطمینانی بتائے دیتی ہے کہ وہ مسلسل ایک کھوج اور جستجو میں رہے ہیں۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کی شناخت سے تو کبھی بھی دستبردار نہیں ہوئے لیکن انٹر سے لیکر بی اے اور ایم اے تک اپنے زمانے کے عام پڑھے لکھے نوجوانوں کی طرح مذہب بیزاری کے جراثیم ان کے اندر بھی تھے۔ پھر تحریک پاکستان کے زمانے میں ہندوؤں اور ترقی پسندوں کی سیاست کے ردعمل اور مسلمانوں کی کلچری وراثت سے بے پناہ رغبت نے ان کے اندر قابل لحاظ مذہبی جوش خروش بھی بھر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مذہب ان کا روحانی و جذباتی تجربہ اب بھی نہیں تھا۔ یعنی جن معنوں میں وہ ادب کو اپنا جبلی تجربہ مانتے تھے، اس معنی میں مذہب ان کا حسی تجربہ نہیں تھا۔ ان کے معروف مضمون ''انسان اور آدمی'' 1949ء کے آخر میں اسلام کا ذکر تو آیا ہے مگر کسی قلبی لگاؤ کے بغیر ایک کلچری قوت کے طور پر۔ اس زمانے میں مذہب اسلام سے خواہ ان کی پوری تسلی نہ بھی ہوتی ہو مگر یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سوائے ایک مختصر سی مدت کے انہوں نے انکار و منفیت اور لامذہبیت کے مقابلے میں ہمہ گیر اخلاقی اقدار، فرد کی ذہنی و روحانی آزادی پر زندگی کے حسن و نظم، مشرق کی روحانی جستجو اور خدا پر ایمان کو اکثر و بیشتر ترجیح دی ہے۔

ابتدائے بیسویں صدی کی تمام بڑی فکری تحریکوں (از قسم حقیقت نگاری، ترقی پسندی، علامت

نگاری، دادا ازم، سرریلزم، وجودیت جنہیں ہم "جدیدیت" کے عمومی عنوان کے تحت رکھ سکتے ہیں) میں انکار، منفیت اور تخریب وانہدام کی روح کارفرما رہی ہے۔ عسکری بھی اسی فضا کے پروردہ تھے مگر ان کی جدیدیت نفی بے اثبات کی قائل نہیں تھی:

> "مارلو کا شیطان تک اعتراف کرتا ہے کہ خدا سے چھٹ جانا دوزخ کے عذابوں سے بھی شدید تر عذاب ہے۔"

(انسان اور آدمی، ص 67)

لہٰذا جدیدیت سے روایت تک کا سفر ان کے لیے نفی سے اثبات تک کا سفر تھا۔

ان کے مضامین "انسان اور آدمی" اور "آدمی اور انسان" انیسویں اور بیسویں صدی کے مغربی اور روسی ادب میں پائے جانے والے تصورِ انسان سے بحث کرتے ہیں۔ جن کا لب لباب یہ ہے: "انسان اور آدمی" میں ان کا کہنا یہ تھا کہ تعیم (مجرد "انسان" پرستی = انسان کی عام حاجت مندیوں اور جبلی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے قائم کیا ہوا تصور) کو تخصیص ("آدمی" کے روزمرہ کے حیاتی تقاضے) سے آزاد نہیں ہونا چاہیے جو روسو کے اور روسی تصورِ انسان کا خاصہ رہا ہے۔ جبکہ "آدمی اور انسان" میں انہوں نے یہ کہا کہ تعیم (انسان کی کوئی ایسی مکمل اور واضح تعریف جسمیں "آدمی" کو رد کیے بغیر "انسان" کا تخلیقی تصور وضع کیا جائے) کی ذمہ داری قبول کرنے سے ہچکچاہٹ ہو تو تخصیص (زندگی سے خیر کے وجود کا انکار نہ کرتا مگر مطالعہ صرف بدی کا کرتا) دلدل بن جاتی ہے، جس میں امریکی انسان دھنسا ہوا ہے۔ دراصل عسکری اس دور میں کسی ایسے تصورِ انسان کے متلاشی تھے جس میں ایک طرف روزمرہ کی عام ضرورت مندیوں اور ٹھوس جبلی تجربات کے حامل انسان (بہ اصطلاح عسکری "آدمی") سے بھی صرف نظر نہ کیا گیا ہو اور دوسری طرف محض "آدمی" کی جبلی ضرورتوں اور فطرت کے تخریبی رجحانات ہی توجہ کے قابل نہ ہوں۔

ان کا کہنا تھا کہ 20ویں صدی کے مغربی ادب میں انسان کا المیہ تصور پایا جاتا ہے، جبکہ ضرورت ہے کہ اس کا نشاطیہ تصور بھی وضع کیا جائے جو موجود مغربی ادب میں کم یاب ہے۔ اپنے مضمون "آدمی اور انسان" کے زمانے، 1956ء تک عسکری الم ونشاط کے امتزاج کے حامل انسان کے کسی ایسے جامع تصور کو "کسی ماورائے انسانی طاقت کے وجود کا سوال اٹھائے بغیر" حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات ان کے مزاج کے اس پہلو کی عکاس تھی جو مغرب کی سیکولر فکر کا پرداختہ تھا۔ ستارہ یا بادبان میں شامل ان کے وہ مضامین جو تخلیقی عمل کی ماہیت کو نئی نفسیات کے نظریوں میں سمجھنا چاہتے ہیں ان میں بھی عسکری اس کشمکش میں نظر آتے ہیں کہ انسان کے اندر تخلیقِ فن کا منبع کہاں ہے اور فن پارہ اگر جذبے کی تطہیر و تہذیب ہے تو اس سے خود فن کار کی شخصیت میں تنظیم وتہذیب کیوں پیدا نہیں ہوتی؟

علاوہ ازیں ان کے مضمون "پیروی مغربی کا انجام" کے بین السطور یہ ظاہر ہے کہ مشرقی اور مغربی ادب میں طرزِ احساس کے فرق کا مسئلہ بھی ان کے لیے بہت تشویش کا باعث تھا اور وہ اس فرق کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ان کی زندگی میں چھپنے والے اس دوسرے مجموعے کے مندرجات ان کے عبوری دور کے تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں جب وہ ادب سے اس" مابعد الادبیات" یعنی 'روایت' اور مابعدالطبیعیات کی طرف جا رہے تھے جس کا سب سے پہلا اظہار ان کے مضمون "محسن کاکوروی" 1959ء میں ہوا ہے۔ محسن کاکوروی کی نعت میں عسکری کو وہ تصورِ انسان مل گیا جس کی حیثیت محض انسانی نہیں بلکہ برزخِ کبریٰ کی ہے یعنی بندہ و مولا صفات جو ادھر مخلوق میں شامل ادھر اللہ سے واصل ہے۔ محسن کے نعتیہ قصیدے میں عسکری کو یہ تصورِ انسان اس ادبی حسی، جبلی تجربے کے ساتھ ملا تھا جو گویا ان کے لیے چھٹی حس کا قائم مقام تھا۔ اب انہیں یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ الم و نشاط کے امتزاج و توازن کے حامل جس تصورِ انسان کے نمونے مغربی ادب میں نایاب تھے، دراصل ادب، یا کم از کم مغربی ادب، اس کی دریافت و حصول کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ مغرب میں انہیں نشاطیہ رنگ والے ادبی نمونے کم نظر آئے تھے، اس کے برعکس محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری کی اہم ترین خصوصیت ان کے نزدیک اس کی نشاطیہ کیفیت ہی تھی:

> "محسن کے مزاج میں جو ولولہ، شوخی، جولانی، اور نشاطیہ کیفیت تھی اسے نعت گوئی میں آ کر انہوں نے بدلنے کی کوشش نہیں کی... کہ ذاتِ محمدی ﷺ کی برکت سے دنیا میں نشاط کے سوا کسی اور کیفیت کی گنجائش ہی نہیں رہی۔"

("محسن کاکوروی" مشمولہ ستارہ یا بادبان، ص ۲۵۰)

آنحضرتؐ کے وسیلے اب عسکری یہ بھی جان گئے تھے کہ ماورائے انسانی طاقت کے وجود کے بغیر کوئی تصورِ انسان مکمل نہیں ہو سکتا۔(60) ایک اور بہت بڑا مسئلہ جو ان کے ہاں شروع ہی سے موجود تھا اور جس کا واضح اظہار ان کے مضمون "پیروی مغربی کا انجام" میں ہوا تھا، مشرقی اور مغربی ادب میں موجود اس بنیادی فرق کو جاننے کا تھا جسے وہاں انہوں نے طرزِ احساس کہا تھا۔ اب وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے، طرزِ احساس کا یہ فرق اصل میں اس تصورِ حقیقت کا فرق ہے جو مشرق و مغرب کی فکر میں صدیوں سے کارفرما ہے اور ادب بھی اس سے خالی نہیں۔ یہیں سے ان کے تصورِ روایت کا آغاز ہوتا ہے۔

عسکری کا تصورِ روایت وہ نہیں جو اردو تنقید میں ٹی ایس ایلیٹ کے زیرِ اثر ایک دور میں بہت زیرِ بحث رہا ہے۔ 1953-54ء تک خود عسکری بھی روایت اور تجربے کے ذیل میں اس سے متاثر رہے ہیں لیکن 1960ء کے بعد انہوں نے اس سے سخت اختلاف کیا ہے۔ عسکری کے نزدیک روایت کا مطلب عادت یا وہ عمل نہیں جو کوئی قوم یا گروہ سو دو سو سال سے کرتا چلا آیا ہو۔ اس کا مفہوم رسم و رواج، دستور،

وراثت اور ترکہ بھی نہیں، کیونکہ یہ سب چیزیں بدل جانے والی ہیں جبکہ "روایت" وہ شے ہے جو بدلتی نہیں۔" روایت" درحقیقت اس تصور حقیقت کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کا نام ہے جو عسکری کے نزدیک دنیا کے ہر بڑے ادب کی تہہ میں موجود ہوتا ہے:

"مشرق کی بڑی تہذیبوں میں ہر قسم کے ثانوی اختلافات کے باوجود بنیادی طور سے حقیقت کا ایک واحد تصور ملتا ہے۔ یہاں حقیقت کے کئی درجے ہیں، لیکن یہ سب درجے ایک بنیادی حقیقت کے اندر سے نکلے ہیں اور اس کی بدولت وجود رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دراصل حقیقت صرف وہی ایک ہے۔ باقی سب اس کے ظہور کی مختلف شکلیں ہیں۔۔۔۔ یہ بنیادی حقیقت ہر قسم کے تعینات سے ماورا ہے۔ ظہور کے دائرے سے بھی اوپر ہے۔ اس لیے الفاظ میں اس کا بیان بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس حقیقت کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں تو بس اتنا ہو سکتا ہے کہ تعینات کے بارے میں ہم جو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں، اس میں "نہیں" لگاتے جائیں۔ حقیقتوں کے درجات کے لحاظ سے اسلامی اصطلاح میں اسے عالم لاہوت کہا جاتا ہے۔"

(وقت کی راگنی، ص ۱۱)

یہ حقیقت عظمیٰ، حقیقت الحقائق، اپنی اصل کے اعتبار سے وراء الورا ہے، وجود مطلق ہے اور بلالحاظ تعینات، وجود باری تعالیٰ ہے جو ماورائے عالم طبعیات ہے۔ باقی کل عالم اسی کی مخلوق ہے۔

رینے گینوں کے حوالے سے عسکری کا کہنا ہے:

"روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر قائم ہو۔ مابعد الطبیعیات چند نظریوں کا نام نہیں۔ التوحید واحد۔ مابعد الطبیعیات صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یہی اصلی اور بنیادی روایت ہے۔"

(وقت کی راگنی، ص ۱۰۸)

وجود مطلق سے لیکر عالم موجودات تک کے سلسلے میں ایک اتصال بے تکیف بے قیاس ہے:

"یہ ہے وہ تصور جو روایت کی جڑ ہے۔ اگر ادب اس تصور کی بنیاد پر قائم ہے تو وہ روایتی ہے ورنہ نہیں۔"

(وقت کی راگنی، ص ۱۰۹)

عسکری نے تصور حقیقت پر جو بحث کی ہے وہ حقیقت کا ایک درجہ وار تصور ہے جہاں حقیقت عظمیٰ سے

لے کر اونی ترین حقیقت تک ایک ربط اور نسبت ہے۔ اس تصور کو اس کے تمام مضمرات سمیت سمجھنے کا نام ''روایت'' ہے۔ اس اعتبار سے روایت ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور ایک ہی رہے گی اس میں تبدیلی کا گذر نہیں۔ اس بنیادی روایت میں ذیلی روایتیں بھی ہو سکتی ہیں مگر وہ اسی کے ماتحت ہوتی ہیں۔

> ''مشرق کی حد تک تو مسئلہ بالکل واضح ہے۔ مسلمان ہوں یا ہندو یا بدھ، سب کا اتفاق دو چیزوں پر تو ہے ہی۔ پہلی بات یہ کہ معاشرتی روایت، ادبی روایت، دینی روایت، یہ الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک بڑی اور واحد روایت ہے جو سب کی بنیاد ہے اور باقی چھوٹی روایتیں اسی کا حصہ ہیں، اور اسی سے نکلی ہیں۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اس بنیادی روایت کا نام 'دین' ہے۔ ثانوی روایتوں میں شامل ہونے کے لیے اس بنیادی روایت میں شامل ہونا لازمی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی روایت نکلتی ہے کسی آسمانی یا مقدس کتاب سے، پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں اس روایت کے مستند نمائندے۔ اور صرف انہی نمائندوں کا قول استناد کے قابل ہوتا ہے۔ پھر ایک تیسری بات ہے جو ہر زبان میں خود لفظ 'روایت' کے مفہوم کا لازمی جز ہے: یعنی روایت وہ چیز ہے جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچائی جائے۔''

(وقت کی راگنی ،ص ۱۱۴،۱۱۳ ؛ مزید ص ۵۵ ، ۱۵۳)

اس مشرقی تصور حقیقت و روایت کے مقابلے میں مغرب کے بارے میں عسکری کا کہنا ہے کہ وہاں شروع سے آخر تک کوئی ایک تصور حقیقت ہے ہی نہیں اور روایت کا مفہوم بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ اس اعتبار سے موجودہ مغربی معاشرہ قطعی غیر روایتی تہذیب یعنی جدیدیت کے ذیل میں آتا ہے۔ یہاں ''جدیدیت'' سے مراد وہ فکری رجحان ہے جو مغرب میں سولہویں صدی کے بعد سے سیکولر انداز میں پروان چڑھنا شروع ہوا اور روشن خیالی کے دور سے گزرتا ہوا موجودہ عہد تک پہنچا ہے۔ عسکری کے الفاظ میں:

> ''نہ صرف یورپ بلکہ انسانیت کی تاریخ میں جو بالکل نئی بات رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ حقیقت کا دائرہ صرف مادی دنیا تک محدود کر دیا گیا۔ پہلے تو لوگوں نے صرف اتنا کہا کہ مادی دنیا سے آگے بھی اگر کوئی حقیقت ہے تو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ انیسویں صدی سے مغرب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مادی دنیا سے آگے کوئی حقیقت ہوتی ہی نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ دوسرا خیال یہ پیدا ہوا کہ ہمیں ہر بات پر صرف انسان کے نقطہ نظر سے غور

کرنا چاہیے، خدا کے نقطۂ نظر سے نہیں"۔

(وقت کی راگنی، ص ۱۷)

مغربی تہذیب کی یہی وہ فکر ہے جسے عسکری آخری دور میں روایت کے مقابلے میں جدیدیت قرار دیکر گمراہی کہنے لگے تھے۔ مشرق و مغرب کے طرز احساس میں جو فرق ہے (جس کی وجہ سے ان کا ادب ایک دوسرے سے مختلف ہے) اس کا بہت گہرا تعلق ان تہذیبوں میں کارفرما تصور حقیقت اور تصور روایت کے اختلاف سے ہے۔ مشرق و مغرب کے اس بنیادی اختلاف کا اثر صرف ادب ہی پر نہیں بلکہ تہذیب و ثقافت، اخلاق و ادب اور معاشرتی زندگی کے ہر گوشے اور دین و مذہب پر بھی پڑا ہے۔

عسکری جو پہلے ہی اپنے مخصوص تصورات کی بنا پر ادب کو کل زندگی اور بطور خاص تہذیب و کلچر کا مظہر مانتے تھے اب اس میں مابعد الطبیعیات کا انعکاس بھی دیکھنے لگے تھے۔ یاد رہے کہ ان کے نزدیک مابعد الطبیعیات محض چند مجرد فلسفیانہ تصورات کے مجموعے کا نام تھا نہ یونانی و مغربی فکر کی طرح وہ اسے محض "علم وجود" Ontology کا مترادف سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک اس سے مراد عالم طبعی سے آگے کے وہ تمام عوالم ہیں جن کی انتہاؤں کی انتہا حقیقت عظمیٰ ہے جس کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی کا کہنا تھا کہ "وجوب وجود اس مقدس درگاہ کا کمینہ خادم ہے اور سلب عدم اس بارگاہ بزرگ کا کمینہ خاک روب ہے"۔ اسی سے عسکری ارسطو کے نظریہ نقل (Mimesis) کو رد کرتے ہیں جس کے مطابق ادب و فن حقیقت کی نقل ہے۔ کیونکہ اسلام اور مشرق میں حقیقت کا جو وراء الوراء تصور ہے اس کی نہ نقل اتاری جاسکتی ہے نہ عکاسی اور نہ نمائندگی کی جاسکتی ہے۔

عسکری حقیقت اور روایت کے اس تصور تک اتفاقاً نہیں بلکہ مغربی ادب کے دشت ویران کی سیاحی میں کئی برس کے جاں گسل سفر اور بے حاصلی کے نتیجے میں پہنچے تھے، انہیں یہ تصورات بلاشبہ رینے گینوں کے واسطے سے ملے تھے مگر گینوں کو بھی انہوں نے اپنے اسی تجربے کی روشنی میں قبول کیا تھا۔ اب وہ پیروی مغربی میں ناکامی کے اصل اسباب کو بھی جان گئے تھے اور مشرق و مغرب کے طرز احساس میں فرق کی نوعیت بھی۔ یہ ایک سراسر ادبی مسئلہ تھا مگر اسکی کھوج انہیں ادب و فن کے ان "غیر ادبی اصولوں" تک لے گئی جو براہ راست تصور حقیقت سے پھوٹے تھے: "مشرق میں تہذیب کی بنیاد مابعد الطبیعیات پر ہے اور مغرب میں طبیعیات پر۔" (61) لہٰذا ان کے نزدیک ادب جیسے فنی مظہر پر بات کرتے ہوئے بھی غیر ادبی و غیر فنی معاملات (مثلاً مابعد الطبیعیات و تہذیب وغیرہ) سے صرف نظر ممکن نہیں۔

حقیقت، روایت، ادب، تہذیب اور مذہب کے بارے میں ان تصورات کی وجہ سے انہوں نے جو عملی نتائج اخذ کیے افسوس کہ یہ مختصر تعارفی کتاب ان کے بیان کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ ساری تفصیلات ان کی کتاب وقت کی راگنی اور جدیدیت میں موجود ہیں۔ ان خیالات میں ادب، تہذیب اور جدید

دنیا کی نوعیت کے بارے میں جو گہرے، دور رس اور دہلا دینے والے نتائج مضمر ہیں ان کی ایک جھلک سلیم احمد کی کتاب محمد حسن عسکری -- انسان یا آدمی؟ کے آخری ابواب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ عسکری کی تنقید کا یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے برملا کہا جا سکتا ہے کہ "نقاد" کا لفظ اپنے مروجہ مفہوم میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ نہیں کرتا۔

آخر میں ہم عسکری کی ادبی مہمات کے ایک اور اہم پہلو کی طرف چند اشارات کر کے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ وہ ہے ان کی ترجمہ نگاری کا فن اور اس کا اردو زبان، نثر اور اس کے اسالیب سے تعلق۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے ابتدائی تراجم کا محرک معاشی ضرورت تھی۔ مگر اس ضرورت کے تحت کیے گئے ترجمے بھی زبان و بیان اور نثری اسالیب کی بے حساب خوبیاں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ سابقہ صفحات میں ہم نے عسکری کے تنقیدی تصورات کی طرف اشارہ کیا ہے: یہ تصورات و نظریات جتنے منفرد اور یکتا تھے ان کا بیرایہ اظہار بھی اتنا ہی خالص اور انوکھا تھا۔ زبان، نثر اور اسالیب کے بارے میں ان کے جو تنقیدی خیالات تھے ان کی نثر انہی کے تخلیقی اظہار کا عملی نمونہ تھی۔ اس نثر میں اور ان کی افسانہ نویسی، ترجمہ نگاری، اسالیب بیان اور نثر کے بارے میں ان کے خیالات میں بہت گہرا تعلق ہے۔ یوں ان کا افسانہ، تنقید اور ترجمہ تینوں مل کر ایک ہی وحدانی مہم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اپنے پہلے تنقیدی مجموعے انسان اور آدمی کے پیش لفظ میں انہوں نے لکھا تھا:

> ''میں اپنی افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ دونوں کے پیچھے تجربہ اور تحریک وہی ایک ہے۔''

(انسان اور آدمی ص 6)

اس سے پہلے جزیرے کے اختتامیے میں بھی وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے تخلیقی اور تنقیدی شعور میں دوئی نہیں یکجائی تھی۔ یہی بات بڑے یقین سے ان کی مترجمانہ مہمات کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یوں تو انہوں نے غیر افسانوی تحریروں کے ترجمے بھی کیے ہیں مگر ان کے اہم ترین کارناموں میں سے ایک ان کے فکشن کے تراجم ہیں۔ تخلیق سے تنقید اور ترجمے کی طرف عسکری ایک منصوبے کے تحت آئے تھے۔ اس کے پیچھے جو مقاصد کارفرما تھے وہ اردو زبان و نثر کے مروجہ اسالیب کو بھنا، ان میں نئے قسم کے محسوسات اور تجربات کو بیان کرنے کی سکت پیدا کرنا اور اس کے ذریعے اردو فکشن کی تخلیقی جہت میں نیا نظام محسوسات متعارف کرانا تھا جو آگے چل کر نئے ادبی تجربات کا راستہ ہموار کرنے والوں کے ادبی شعور میں تنوع پیدا کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔

عسکری نے نہ صرف فرانسیسی و انگریزی کے بہترین نثری اسالیب کے حامل فن پاروں کو اردو میں منتقل کیا تھا بلکہ ترجمہ نگاری کے مسائل پر لکھتے ہوئے مغربی زبان و نثر اور اسالیب اظہار کے سانچوں اور

ساختوں کے ان نادر پہلوؤں کی طرف بھی اردو کے ادیبوں کو متوجہ کیا جن کی طرف عسکری سے قبل کم ہی کسی کی نظر جاتی تھی۔ اس طرح اردو نثر اور اسالیب بیان کی کوتاہیوں کا احساس دلا کر ایک طرف وہ خود اس کے مروجہ سانچوں میں نئے تجربات بھرنے کی مہم میں مصروف تھے اور دوسری طرف معاصر لکھنے والوں کی اس خود اطمینانی پر ضرب لگا رہے تھے کہ اردو نثر ہر قسم کے ادبی تجربات کے بیان پر قادر ہے۔ ان امور کی کچھ تفصیل یہ ہے: عسکری کا کہنا تھا کہ 1936ء کے قریب ''نئے ادب'' کے ذریعے اردو میں جو تبدیلی آئی وہ فی الاصل موضوعات اور تجربات کی تھی۔ اس میں ذریعہ اظہار اور اسالیب بیان کی طرف توجہ کم تھی۔ اندرونی تجربے کو اسلوب اور الفاظ کے استعمال سے کیونکر محسوس کیا جائے اور ان محسوسات کے بیان کے لیے اسالیب اور ذرائع اظہار میں تبدیلی کی ضرورت ہے یا نہیں، اس طرف کم توجہ دی گئی تھی۔ ہمارے ہاں سر سید و حالی کے زیر اثر صرف رواں، سادہ اور سلیس اسلوب کو ہی اچھا اسلوب سمجھا جاتا ہے۔ طویل اور پیچیدہ جملہ جو کسی خیال کے مختلف پہلوؤں یا کسی تصویر کے الگ الگ اجزا کو ایک وحدت میں سمو کر اس طرح ادا کر سکے کہ وہ ایک مکمل اور یک لخت تجربہ محسوس ہو، لکھنے کی ضرورت ہمارے ہاں کبھی سمجھی نہیں جاتی۔ ایسے اسلوب کو عسکری ''تجربے کی رنگارنگی، پیچیدگی اور وحدت کو الفاظ کی گرفت'' میں لانے کا فن کہتے تھے۔(62) ان کا خیال تھا کہ نئے تجربات و محسوسات کے بیان کے لیے اگر نئے اسالیب کی ضرورت ہے تو بعض اوقات محض نئے اسالیب بیان وضع کرنے کی کوشش سے نئے محسوساتی مرکب اور دیکھی بھالی چیزوں کو نئی طرح سے محسوس کرنے کا طریقہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اسالیب بیان اور نثری سانچوں پر یہ بحثیں عسکری نے زیادہ تر اپنے اُن مضامین میں لکھی ہیں جو ستارہ یا بادبان میں ''موجودہ اردو ادب'' کے ذیل میں ہیں اور کم و بیش 54-1953ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں ان امور کا شعور اپنے افسانہ نگاری کے دور میں بھی تھا۔ وہ دوسرے ادیبوں ہی سے ایسے مشکل مطالبات نہیں کر رہے تھے بلکہ اس سے کہیں پہلے خیال اور تجربے کو یک آنی منظر بنا کر بیان کرنے کا وحدانی تجربہ وہ خود اپنے افسانوں میں کر چکے تھے۔ اس کے لیے ان کے افسانے ''حرام جادی'' 1940ء کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> ''جب وہ اپنی اُونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دھوپ میں جلتی بھنتی، سڑکوں پر سے گزرتی تو اُسے دور آلھا گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ، اور درختوں کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے، دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بیزار کن اور پُر استہزا معلوم ہوتے، اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔''

(''حرام جادی''، عسکری کے افسانے، ص ۳۸)

اس مسئلے کا تعلق عسکری کے مغربی شعور اور خصوصاً وہاں کی نثری روایت سے بہت گہرا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو کے ذرائع اظہار اس طرح کے اسلوب کو دور تک سہارنے کی سکت اس لیے نہیں رکھتے کہ ہمارے ہاں اس طرح کے طویل جملے میں سے صفاتی کلمات کو اسم سے دور ہٹا کر ضمنی جملے کی شکل دے دی جاتی ہے۔ یعنی ایک مکمل تصویر کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ اردو نثر میں یہ سکت اور خوبی پیدا کرنے کے لیے ہی انہوں نے فرانسیسی کے چند چنیدہ قسم کے ناولوں کو اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک عسکری کے ترجمے مادام بوواری کے ابتدائی صفحات پر ہی دیکھی جا سکتی ہے جہاں انہوں نے فلوبیئر ہی کی طرح اردو میں بھی علامات اوقاف کے ذریعے معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جو بقول انہی کے کاتب صاحب نے سب گڑبڑ کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی لیے سراج منیر کا کہنا ہے:

> ''عسکری صاحب نے اردو کے افسانوی ادب کو شاید اپنی کہانیوں سے اس قدر مالا مال نہیں کیا جس قدر تراجم سے۔ جدید اردو کی نثر خاص طور پر ان کا ہدف تنقید تھی۔ چنانچہ انہوں نے صرف تنقید ہی نہ کی بلکہ فرانسیسی کے ان شاہکاروں کو، جنہیں خود انگریزی والے اپنی وسیع نثری روایت کے باوجود ہاتھ لگانے سے جھجکتے تھے، انہوں نے اردو میں کچھ اس خوبی سے ترجمہ کر دیا کہ جس کی صحیح داد وہی لوگ دے سکیں گے جو تینوں زبانوں سے بیک وقت واقف ہیں۔ فکشن کے ان تراجم سے جو نئے اسالیب، تجربے کی جو نئی لسانی وضعیں، جملے کی ساخت کی نت نئی معنویتیں سامنے آئیں وہ اپنے طور پر ایک الگ مطالعے کی متقاضی ہیں۔''

(سراج منیر، "محمد حسن عسکری: نیض روایت کا منکر"، مشمولہ مشرق کی بازیافت، ص ۱۰۸)

عسکری کی ترجمہ نگاری کے یہ دو پہلو ہیں جو ایک مقصد کے طور پر ان کے سامنے تھے۔ ترجمے کا مقصد وہ محض ایک زبان کی کہانی یا خیالات کو دوسری زبان میں منتقل کر دینا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے ذریعے وہ دوسری (یعنی اردو) زبان میں تخلیقی تجربوں کو محسوس کرنے کا ہنر پیدا کرنا اور تخلیقی قوتی کی بیداری چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جن ترجموں کی بدولت تخلیقی ادب پر کوئی اثر نہ پڑے ان کا کوئی جواز نہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں اسالیب بیان اور اردو نثر کے جس مسئلے کا ذکر ہوا خود عسکری کے نثری اسلوب میں اسی شعور کا تخلیقی استعمال ہوا ہے۔ اپنے افسانوں سے لیکر ترجموں تک اور پھر تنقیدی نثر میں انہوں نے ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جس کی خوبیاں ان کے مخالفین بھی ماننے پر مجبور ہیں۔ ان کا افسانہ ''پھسلیوں کے دام'' جس ''تنقیدی شعور'' کا زائیدہ ہے اسی شعور نے ان سے وہ باتیں (مثلاً بورژوا اخلاقیات کی خود فریبی کا ڈرا اور ریاکاری وغیرہ) ''سخن کا پردہ'' ہٹا کر تنقیدی مضامین میں بھی کہلوائی ہیں۔

وہ استہزائیہ لے اور کرختداری لہجہ، جو ان کے بعض افسانوں کی جان ہے زیادہ واضح طور پر ان تنقیدی مضامین میں بھی موجود ہے۔ بعض لوگ عسکری کے چمکتے دمکتے فقروں اور استہزائیہ اسلوب کے شاکی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنے اس شوخ و شگفتہ اسلوب سے انہوں نے تنقید میں وہی کام لیا ہے جو بعض اوقات منٹو چٹکلے بازی سے اپنے افسانوں میں لیتا ہے۔ وہ مغربی شعور، تنقیدی خیالات اور تہذیبی و سماجی تصورات جو بیسویں صدی کے شروع میں ہمارے عام پڑھے لکھے طبقے اور ادیب برادری کے لیے "غیر متبدل معیار" کی حیثیت رکھتے تھے، عسکری نے شروع ہی سے انہیں اپنے فقروں کی زد پر رکھ لیا تھا۔ مارکس اور گورکی سے لیکر اپنے پسندیدہ فرانسیسی اسلوب کے شہیدوں کے "مقبول عام تصورات" تک انہوں نے سب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا برتاؤ کر کے ان کی ہیبت کو بے تکلفی کے ماحول میں بدل دیا تھا۔ اس سے ہمیں پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ مغربی ادب بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے رعب میں آئے بغیر اس پر تنقیدی نظر ڈالی جا سکتی ہے اور یہ کہ اس کے نتیجے میں پیدا کیا جانے والے اردو ادب کی حیثیت "مغربی ادب کے مشرقی ایڈیشن" سے زیادہ نہیں۔ کیا جزیرے کے "اختتامیہ" (1943ء) سے لے کر "مشرق و مغرب کی کشمکش اردو ادب میں" (1960ء مشمولہ وقت کی راگنی) اور بعد تک عسکری یہ بات مسلسل نہیں کہہ رہے تھے؟ مغرب کے دبدبے کے بالمقابل اردو کی ادبی، تنقیدی اور تہذیبی فضا کو احساس مرعوبیت سے نکالنے کی یہ کوشش، جو انہوں نے اپنے اسلوب کے ذریعے بھی کر دکھائی، ان کا ایسا کارنامہ ہے جو تا حال یکتا ہے۔

عسکری کے تنقیدی خیالات کا یہ سرسری جائزہ، جسے اس کتاب کی نوعیت اور جگہ کی قلت کی وجہ سے تفصیلی دلائل سے آراستہ نہیں کیا جا سکتا، جدید اردو تنقید کی تاریخ میں ان کے کام کی نوعیت اور انفرادیت واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔ ابتدائے سفر سے لے کر آخری دن تک عسکری کے ذہن کی مصروفیت اور مختلف ادوار میں مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ان کے تنقیدی خیالات میں تنوع بھی بہت ہے اور اول و آخر میں حیرت انگیز مشابہت و مطابقت بھی۔ وہ بہت کم حالات کی رو میں بہے ہیں۔ ان کا زیادہ سفر وقت کے تند و تیز دھاروں کی مخالف سمت میں رہا ہے، بنے بنائے خیالات، جمے جمائے تصورات اور گھڑے گھڑائے جوابات سے عسکری کبھی مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی خاص صورت حال میں اختیار کئے ہوئے اپنے خیالات میں بھی وہ بدلے ہوئے تناظر میں کانٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ شروع ہی سے ان کا سفر ایک خاص رخ پر تھا، جس کی کوئی متعین منزل ان پر واضح نہ تھی مگر ریاکاری، دکھاوے اور فیشن کی خاطر انہوں نے کبھی کوئی موقف اختیار نہیں کیا؛ ان کی ادبی جستجو اور تفتیش کا واحد محرک حق و صداقت کی جستجو تھا۔ اس دوران انہوں نے اپنے معاصر ادب کو مغربی خیالات، افکار، تحریکوں اور رجحانوں سے جتنا آشنا کیا، مغرب کے تنقیدی و تخلیقی ادب و فن کے جتنے اہم ناموں سے اردو

تنقید کو متعارف کرایا اور مغرب کے تخلیقی تجربوں کو اردو کی جدید اصناف میں برتنے کا جس طرح احساس اجاگر کیا اس میں بہت کم لوگ عسکری کے قریب پہنچتے ہیں۔ ان کی تنقیدی فعالیت کا ایک اہم پہلو اپنے معاصر ادب اور فکری رجحانوں سے بیچ میدان کی پنجہ آزمائی ہے، یہ ایک ایسی سرگرمی ہے جو ایک نقاد کے علم وکمال، تنقیدی بصیرت اور قدری فیصلوں کے لیے زبردست آزمائش ہوا کرتی ہے۔ عسکری کی تنقید کی ایک ایک سطر گواہ ہے کہ آزمائش کے اس دریائے آتش میں انہوں نے ساری زندگی پیراکی کی ہے۔

اپنے ابتدائی دور میں انہوں نے رومانوی جمال پرستوں کے مقابل موضوعاتی اور اسلوبی سطح پر سماجی شعور اور حقیقت نگاری کی بات کی تھی۔ مگر پھر "نئے ادب" اور ترقی پسندی والوں کو چند مخصوص تجربات اور موضوعات کا اسیر پا کر ان سے اپنا راستہ جدا کر لیا۔ جس دور میں وہ ہیئت پرستی اور اسلوب کے شہید کہلاتے تھے، اسی زمانے میں انہوں نے ادب کی گہری اخلاقی معنویت کے سوال اٹھا کر اپنے زوال پسند فرانسیسی سورماؤں کے سامنے "خالص ادب وفن" کو سراب قرار دے دیا تھا۔ قیام پاکستان کے زمانے میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مذہبی شعور سے وابستگی اور ہند اسلامی کلچر کی پسندیدگی کا انہوں نے اس وقت برملا اعلان کرنا شروع کر دیا تھا جب ترقی پسند حلقوں میں یہ بات نہ صرف خلاف فیشن تھی بلکہ "وسیع المشرب انسان دوستی" کے بھی منافی سمجھی تھی۔ پھر اسلامی و پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کی ضرورت کی طرف انہوں نے پاکستانی ادیبوں کو اس وقت متوجہ کرنا شروع کیا تھا، جب معاصر فضا "کون کرسکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر" کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ مگر انہی حلقوں نے جن کی طرف سے اس وقت "پاکستانی ادب" کو دیوانے کی بڑ قرار دیا تھا، بعد میں 1970ء کے عشرے میں خود "پاکستانی ادب" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ اس کے بعد عسکری نے ادب کے جمود وزوال کی بحث اٹھائی تو شروع میں اس پر بھی ہنگامہ کھڑا ہوا مگر بعد میں علی سردار جعفری بھی دبے لفظوں میں ادب کے جمود کی باتیں کرنے لگے تھے۔(63) اور پھر 1990ء کی دہائی میں آنے والی ایک کتاب "ادب کی موت" کے حوالے سے آصف فرخی نے اس مسئلے کو عسکری کے حوالے سے چھیڑا تھا۔(64)

اس جمود وزوال کا سبب عسکری ایک تو ادیبوں کا نئے تجربات سے خوف بتاتے تھے اور دوسرے یہ کہ لکھنے والے اپنے ملک وقوم اور معاشرے کی اجتماعی آرزوؤں اور مسائل سے کٹ چکے ہیں۔ اور پھر آخر آخر میں مغربی ادب کو "سڑک کا غل غپاڑہ" (65) قرار دے کر وہ تہذیب و مذہب اور مابعد الطبیعیات اور تصوف کے جن مشرقی سرچشموں تک پہنچے اور "تصور روایت" کی روشنی میں مغربی ادب و فکر کی جن کوتاہیوں کی طرف انہوں نے اشارے کرنا شروع کیے وہ اردو کے کسی بھی ادیب اور نقاد سے ممکن نہ ہوا تھا۔ ان کے مزاج کو اگرچہ فکر مجرد اور عقل ومنطق کی تجریدی دنیا سے کوئی رغبت نہ تھی مگر خاص اس پہلو سے وہ اقبال کے بعد ہمارے اب تک سب سے بڑے "مفکر" بھی ہیں۔ ان کی ادبی مہمات

اور کارناموں کا یہ ابتدائی خاکہ، جس میں ابھی مزید رنگ بھرنے کی پوری گنجائش موجود ہے، اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ جنوبی ایشیا کی تاریخ میں پاکستان کا قیام جس تہذیبی روح کو مجسم کرنے کی کوشش تھی، پاکستان میں عسکری کا تنقیدی شعور انہی اقدار و تصورات کو ادب میں منتقل کر کے عصری طرز حیات و مسائل کے شعور کو ادب کا لازمی جز بنانا چاہتا تھا۔ یہی وہ پاکستانی ادب تھا جس کے معمار اعظم عسکری تھے۔ اس بنا پر راقم کا پختہ یقین ہے کہ پاکستان کی مذہبی، تہذیبی، قومی اور ادبی روح اپنی صدیوں پرانی روح اگر کسی کو بھی اپنے تنقیدی اظہار کا نمونہ قرار دے گی تو وہ عسکری ہی ہوں گے۔ اردو تنقید پر ان کی مہم جوئیوں کے اثرات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تنقیدی سرگرمیوں کے دور میں اردو تنقید میں جوئی لہر اٹھتی اس کا منبع انہی کی کوئی تحریر یا جملہ ہوتا تھا۔ ان کے حمایتی ہوں یا مخالف دونوں ہی کے لیے وہ ایک بنیادی فریم آف ریفرنس رہے ہیں۔ معروف ہندوستانی نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے ایسے مسئلے کے جواب میں کہا تھا:

> "رہا یہ کہنا کہ بیس پچیس برس کے بعد اب عسکری صاحب کا احیاء ہو رہا ہے تو میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دراصل عسکری صاحب کی تنقید کا اثر و نفوذ بھی اردو ادب میں کم نہیں ہوا...ہندوستان کے نئے لوگوں نے، یعنی ہمارے بعد آنے والوں نے، کم ان کا ذکر کیا ہے...(لیکن) پاکستان کی بات دیگر ہے۔ وہاں ان کی بات تقریباً مستند رہ چکی ہے اور بڑی حد تک اب بھی ہے۔"

(شب خون، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۹)

یہی وجہ ہے کہ آج جب اردو کے بڑے بڑے جغادری ادیب اپنی اپنی کتابوں میں آرام سے سو رہے ہیں عسکری اپنے انتقال کے ربع صدی بعد بھی اردو کے سب سے ہنگامہ آرا نقاد کے طور پر زیر بحث ہیں۔(66)

محمد حسن عسکری کی تصانیف وتراجم

تصانیف

1۔ جزیرے، دہلی، ساقی بک ڈپو، 1943ء، (افسانے)

2۔ قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے، دہلی، ساقی بک ڈپو، 1947ء، (افسانے)

3۔ انسان اور آدمی، لاہور، مکتبہ جدید، 1953ء، (ہندوستانی ایڈیشن، علی گڑھ، علی گڑھ بک ڈپو، 1976ء)(تنقید)

4۔ ستارہ یا بادبان، کراچی، مکتبہ سات رنگ، 1963ء، (ہندوستانی ایڈیشن، علی گڑھ، علی گڑھ بک ڈپو، 1977ء)(تنقید)

5۔ وقت کی راگنی، لاہور، مکتبہ محراب، 1979ء، (تنقید)

6۔ جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ، راولپنڈی، عصمت منزل میورو ڈ، 1979ء، (تنقید)

7۔ جھلکیاں، مرتبہ سہیل عمر، نعمانہ عمر، لاہور، مکتبہ الروایت، 1981ء، (تنقید)

8۔ تخلیقی عمل اور اسلوب، مرتبہ محمد سہیل عمر، کراچی، نفیس اکیڈمی، 1989ء، (تنقید)

9۔ محمد حسن عسکری کے افسانے، مرتبہ محمد سہیل عمر، کراچی، نفیس اکیڈمی، 1989ء، (دونوں افسانوی مجموعے یکجا)

10۔ خطوط محمد حسن عسکری، مرتب، عبادت بریلوی، لاہور، ادارۂ ادب وتنقید، 1993

11۔ مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1994ء

(تنقید -- تمام تنقیدی مجموعے یکجا، ماسوائے تخلیقی عمل اور اسلوب)

12۔ عسکری نامہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1997

(افسانہ و تنقید -- دونوں افسانوی مجموعے یکجا مع تخلیقی عمل اور اسلوب)

13۔ مقالات محمد حسن عسکری، جلد اول و دوم، مرتبہ شیما مجید، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، 2001 (تنقید)

14۔ مکاتیب عسکری، مرتبہ شیما مجید، لاہور، القمر انٹر پرائزرز، (قیاساً 2004)

15۔ عسکری کے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ ہنوز اشاعت کا منتظر ہے۔

تراجم

1۔ ریاست اور انقلاب، از لینن، دہلی، ہند کتاب گھر، 1942

2۔ میں ادیب کیسے بنا!، از میکسم گورکی، لاہور، الجدید، س ن

3۔ آخری سلام، از کرسٹوفر اشرووڈ، لاہور، مکتبہ جدید، 1948

4۔ مادام بوواری، از فلوبیئر، لاہور، مکتبہ جدید، 1950

5۔ سرخ و سیاہ، از استاں دال، لاہور، مکتبہ جدید، 1953

6۔ میں کیوں شرماؤں، از شیلا کوفس، کتابستان، الہ آباد، 1959

7۔ موبی ڈک، از ہرمن میل ول، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1967

8۔ متحدہ ولیں رابطے، از شودرلو دلاکلو، (نا تمام ترجمہ) شائع شدہ در مکالمہ 5، کراچی، اکادمی بازیافت، 2000 - 1999

9۔ Distribution of Wealth in Islam (اسلام کا نظام تقسیم دولت، از مفتی محمد شفیع)، کراچی، مکتبہ دار العلوم، 1963۔

10۔ Answer to Modernism (الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ از مولانا اشرف علی تھانوی)، کراچی، مکتبہ دار العلوم، 1976

تراجم پر نظر ثانی از محمد حسن عسکری

1۔ لال نشان، از ستاندال، ترجمہ سیدہ نسیم ہمدانی، نظر ثانی محمد حسن عسکری، ادارۂ منصور، کراچی، س ن

2۔ بڑھا گوریو، از بالزاک، ترجمہ سیدہ نسیم ہمدانی نظر ثانی و مقدمہ محمد حسن عسکری، مکتبہ جدید، لاہور، 1953

3۔ سرود یرانِ اندھیرا گھر، از بالزاک، ترجمہ از سیدہ نسیم ہمدانی نظر ثانی محمد حسن عسکری، نیا ادارہ، لاہور، 1957

4۔ کپتان کا گذرا، از ڈی ایچ لارنس، ترجمہ از سیدہ نسیم ہمدانی نظر ثانی محمد حسن عسکری، نیا ادارہ، لاہور، 1957

انتخاب از محمد حسن عسکری

1۔ میری بہترین نظم، الہ آباد، کتابستان، 1942

2۔ میرا بہترین افسانہ، دہلی، ساقی بک ڈپو، 1943

3۔ انتخاب طلسم ہوش ربا، لاہور، مکتبہ جدید، 1953

4۔ انتخاب میر، ماہنامہ "ساقی" ستمبر 1958

5۔ غزل، انتخاب غزلیات فراق گورکھپوری از ناصر کاظمی نظر ثانی محمد حسن عسکری، نیا ادارہ، لاہور، 1971

مدیرانہ سرگرمیاں

1۔ شریک مدیر ماہنامہ "ساقی" (قلمی معاونین میں عسکری کا نام اگست 1959 تک چلتا رہا)

2۔ "اردو ادب" مطبوعہ مکتبہ جدید، لاہور، (49-1948 میں منٹو کے ساتھ مل کر دو شمارے نکالے)

3۔ مدیر "ماہِ نو" کراچی، (فروری 1950 سے جولائی/ اگست 1950 تک وہ تقریباً پانچ چھ ماہ ماہِ نو کے ایڈیٹر رہے)

4۔ سرپرستی "سات رنگ" کراچی

محمد حسن عسکری پر کتب

1۔ سلیم احمد، محمد حسن عسکری۔ انسان یا آدمی؟ کراچی، مکتبہ اسلوب، 1982

2۔ قاسمی، ابوالکلام (مرتب)، مشرق کی بازیافت (محمد حسن عسکری کے حوالے سے)، علی گڑھ، نئی نسلیں پبلیکیشنز، 1982

3۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر محمد حسن عسکری۔ ایک مطالعہ: ذاتی خطوط کی روشنی میں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1994ء

4۔ عباس، پروفیسر ایس جی، پروفیسر محمد حسن عسکری۔ ایک جائزہ، کراچی، غضنفر اکیڈمی، 2000ء

5۔ اشتیاق احمد (مرتب) محمد حسن عسکری۔ ایک عہد آفریں نقاد، لاہور، بیت الحکمت، 2005ء

عسکری کی تصانیف کا مختصر جائزہ

اس جائزے کی ترتیب یہ ہے: 1- **افسانے** 2- **تنقید** 3- **تراجم** 4- **نظرثانی بر تراجم** 5- **انتخاب** 6- **مجموعہ ہائے خطوط**

افسانے

جزیرے

یہ عسکری کی پہلی تصنیف ہے، جس میں ان کے آٹھ افسانے اور "اختتامیہ" کے طور پر ایک تنقیدی تحریر شامل ہے۔ پہلے پہل شاہد احمد دہلوی کے ادارے ساقی بک ڈپو، دہلی سے 1943 میں چھپی تھی۔ اس کی دوسری اشاعت پاکستان میں آئینۂ ادب، لاہور سے 1961 میں ہوئی۔ کتاب کا انتساب عسکری نے اپنے الٰہ آباد یونیورسٹی کے استاد حتیش چندر دیب کے نام کیا تھا: "حتیش چندر دیب استاد اور رہنما کے نام۔"

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

عسکری کا دوسرا افسانوی مجموعہ، جو دو مختصر اور ایک طویل افسانے (جس پر کتاب کا عنوان ہے) پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی اشاعت بھی ساقی بک ڈپو، دہلی سے 1947 میں ہوئی تھی۔ اسی دوران تقسیم کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا لہٰذا کتاب بہت کم ہاتھوں میں پہنچ پائی۔ 1989 میں نفیس اکیڈمی کراچی نے ان دونوں افسانوی مجموعوں کو یکجا کر کے عسکری کے افسانے کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس پر مرتب کے طور پر محمد سہیل عمر کا نام درج ہے۔ اس میں ایک "عرضِ ناشر" کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا لکھا دیباچہ بھی شامل ہے جس میں عسکری کے کچھ ابتدائی حالات کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں کی نوعیت اور

انفرادیت پر چند مفید اشارات ہیں۔ 1998 میں جب سنگ میل، لاہور نے عسکری نامہ کے عنوان سے ان کی کتاب تخلیقی عمل اور اسلوب شائع کی تو بغیر کسی جواز کے اس میں دونوں افسانوی مجموعے بھی شامل کر دیے۔

عسکری کے افسانوں کی کل تعداد گیارہ ہے، آٹھ پہلی کتاب میں ہیں اور تین دوسری کتاب میں۔ جزیرے میں پہلا افسانہ ''کالج سے گھر تک'' 40-1939 کا اور آخری ''دو تین'' 43-1942ء کا ہے۔ قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے میں پہلا افسانہ ''ذکر انور'' 1943 اور آخری ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' فروری 1947ء کا ہے۔ اس طرح ستمبر 1939ء سے لے کر فروری 1947ء تک عسکری کی مدت افسانہ نگاری صرف ساڑھے سات برس ٹھہرتی ہے۔ اس کے بعد وہ تا عمر کوئی افسانہ نہ لکھ سکے تھے مگر افسانہ لکھنے کی خواہش دل سے کبھی رخصت بھی نہ ہوئی تھی۔ آفتاب احمد کے نام 1950ء کے بعد کے خطوط میں وہ بار بار پھر سے افسانہ، بلکہ ناول تک لکھنے کے ارادے کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں اور حتیٰ کہ دسمبر 1973ء کے خط میں، جب وہ بظاہر ادب ہی سے بہت دور جا چکے تھے، لکھتے ہیں کہ ''اب میں چوبیس سال بعد ایک افسانہ لکھتا ہوں''۔ ظاہر ہے یہ کوئی افسانہ تو نہ تھا مگر افسانے سے ان کی پہلی محبت سے شغف کا اظہار ضرور تھا، جس کی تڑپ ان کے اندر سے کبھی نہ نکل سکی تھی۔ جزیرے کے شروع میں انہوں نے یہ دلچسپ لائنیں لکھی تھیں:

I can call-up old ghosts, and they will come,
But my art limps... I cannot send them home.

اس پر مظفر علی سید نے لکھا تھا: ''یہ بھوت بڑے خود دار ثابت ہوئے کہ عسکری کے بھیجنے سے پہلے ہی رخصت ہو گئے اور کچھ ایسے رخصت ہوئے کہ ان کا پتا ہی نہیں۔''(67)

انسان اور آدمی کے پیش لفظ میں ان کا اپنا یہ کہنا تھا کہ ان کی افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کے پیچھے تجربہ اور تحریک وہی ایک ہے اور یہ کہ جو بات انہوں نے ''انسان اور آدمی'' نامی مضمون میں کی ہے وہی بات اس سے پہلے اپنے افسانے ''پھسلیوں کے دام'' میں کہہ چکے ہیں۔ اس بات کا احساس انہیں جزیرے کے ''اختتامیہ'' میں بھی تھا جب انہوں نے یہ لکھا کہ

''اب اردو ادب کو تخلیق سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے، لیکن تخلیق اور تنقید Caricature اور Parody میں آ کر ایک ہو جاتی ہیں''۔

(عسکری کے افسانے ص 181)

عسکری کے افسانے کے دیباچے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ اس اتحاد کی ایک مثال ان کا افسانہ ''میلاد شریف'' ہے، ''پھسلیوں کے دام'' کو بھی اسی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے اور دوسری بہترین

مثال "ڈکرانور" ہے۔ ان افسانوں کو عسکری کے اس زمانے کے تنقیدی مضامین کی روشنی میں ضرور پڑھنا چاہیے۔

عسکری اپنی بہت سی جہتوں کے لحاظ سے جس طرح فکشن کے بہترین نقاد ہیں اسی طرح وہ اپنے دور کے بہترین فکشن نگار بھی تھے۔ اپنے ادبی کیریئر کے شروعاتی حصے، اور وہ بھی صرف ساڑھے سات برس میں انہوں نے جو چند تخلیقی نمونے چھوڑے ہیں وہ اپنے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے چونکا دینے والے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ان کا شمار اپنے زمانے کی ایک بالکل نئی تخلیقی تکنیک آزاد تلازمہ خیال، شعور کی رو کو اردو میں پہلے پہل کامیاب طور پر برتنے والوں میں ہوتا ہے، جس کے بارے میں ان کا کہنا یہ تھا:

> "اس تکنیک کی دشواری یہ ہے کہ ایک طرف حقیقت ہاتھ سے نہ جانے پائے اور دوسری طرف معنویت اور جمالیاتی حسن بھی برقرار رہے۔"

(جھلکیاں، ص 224)

فنی نقطۂ نظر سے وہ خود کو مواد کے قبضے میں دے دینے کے بجائے 'مواد پر قابض ہونے' اور 'تجربے اور محسوسات پر قادرانہ غلبے کو ادب کی جان' کہتے تھے۔ انہیں اپنا افسانہ "ایک معمولی خط"، "پورا اور" حرام جادی" کا آدھا حصہ زیادہ اسی لیے پسند تھا کہ وہاں یہ خوبی موجود تھی۔ باقی آدھے حصے کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ وہاں میں اپنے کردار کے خیالوں کی رو کا پیچھا کرنے لگا تھا۔ ان کے کرداروں کی مخصوص ذہنی کیفیت تنہائی کا احساس، داخلیت، میلان ہم جنسی، ماحول سے بیزاری اور اسکے خلاف احتجاج و گریز ہے۔ ان افسانوں میں ایک خاص مسئلہ جنسی جذبے کی شدت اور التہاب کو بھی سمجھنا رہا ہے؛ جنس تو پھر بھی بڑا مقدس جذبہ ہے، عسکری کا تو خیال تھا کہ "گندی سے گندی بات اچھا ادب بن سکتی ہے مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بڑے ادب کی پیدائش کے لیے ہر قسم کا نسائی اور مجہول انفعال ایک رکاوٹ ہے"۔ انہیں اعتراف تھا کہ اپنے بعض افسانوں میں وہ جنسی جذبے کی مدافعت کی کوشش میں اس سے دب کر پسپائی اختیار کر گئے تھے۔ مگر اپنے سب سے بدنام افسانے "پھسلن" کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ اس میں انہوں نے پسپائی اختیار نہیں کی۔ یہ غیر مشروط حقیقت نگاری، خارجیت اور معروضیت کا نمونہ ہے البتہ "چائے کی پیالی" کے بعض حصوں کو وہ ضرور فحش سمجھتے تھے کیونکہ اس میں وہ جذباتیت میں پڑ گئے تھے۔ اپنے افسانوں کے بارے میں عسکری کی یہ رائے اس لیے بھی نقل

کی گئی ہے کہ اس امر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ کہ خود مصنف کی نظر میں ان کا کیا مقام ہے، فکشن اور آرٹ کے بارے میں ان کا عمومی نقطہ نظر بھی واضح ہو جائے جو جذبے کی جمالیاتی تجسیم کا قائل تھا جذباتیت و انفعالیت کی گندگی میں لوٹنے کا نہیں۔ ان کے سخت ترین نقادوں نے بھی جزیرے کے ''اختتامیہ'' کو فکشن کی تنقید کا ایسا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے جس کی ایک سطر بھی خالی از معنویت نہیں۔ عسکری کے افسانے اور یہ اختتامیہ مل کر ان کے تخلیقی کمال اور تنقیدی بصیرت کا ایسا نمونہ فراہم کرتے ہیں جہاں اصول اور ان کی اطلاقی معنویت ناخن اور گوشت کی طرح باہم پیوست ہیں۔

*

تنقید

انسان اور آدمی

یہ عسکری کی زندگی میں چھپنے والا ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے، جس کا پہلا ایڈیشن مکتبہ جدید لاہور نے 1953ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا ہندوستانی ایڈیشن علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ سے 1976 میں چھپا تھا۔ 1994ء میں سنگ میل لاہور نے عسکری کے تنقیدی مجموعوں کو یکجا کر کے مجموعہ محمد حسن عسکری کے عنوان سے چھاپا تو یہ اس میں بھی شامل ہوا۔ اس کتاب میں عسکری کے ان مضامین کا انتخاب شامل ہے جو 47-1946ء سے 53-1952ء کے دوران لکھے گئے اور اسی عرصے میں مختلف رسائل میں چھپتے بھی رہے تھے۔ اس میں کل چودہ مضامین ہیں اور سوائے ایک ''اسلامی فن تعمیر کی روح'' کے باقی تمام کا موضوع ادب، تنقید اور نظریاتی مسائل ہیں۔ اس عرصے میں عسکری نے اور بھی بے شمار مضامین لکھے تھے جن میں سے کچھ تو ''جھلکیاں'' کے طور پر ''ساقی'' میں چھپے، جو اب کراچی سے نکلنے لگا تھا اور کچھ دیگر رسائل اور اخبارات میں چھپے تھے۔ انہوں نے بڑا کڑا انتخاب کر کے اس مجموعے میں زیادہ تر وہ مضامین شامل کیے جو فرانسیسی ہیئت پرستوں کی نئی تعبیر اور ترقی پسند نظریات سے اختلاف کے سلسلے میں لکھے گئے تھے۔ پہلی قسم میں ''ہیئت یا نیرنگ نظر؟''، ''فن برائے فن'' ہیں اور دوسری میں ''انسان اور آدمی''، ''مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی''، ''ادب اور انقلاب''، ''فسادات اور ہمارا ادب''، ''منٹو فسادات پر'' اور ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان'' وغیرہ ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین کی ابتدائی تیاری اور محرکات کا ذکر ان کے خطوط نوشتہ 29 جنوری اور 4 فروری 1947ء بنام آفتاب احمد میں بھی ہے۔ یہ اگرچہ عسکری کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے مگر اس سے بھی ان کے وہ بنیادی تنقیدی تصورات پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں جن کا تفصیلی ذکر ہم سابقہ باب میں کر چکے ہیں۔

ستارہ یا بادبان

یہ عسکری کی زندگی میں چھپنے والا ان کا دوسرا اور آخری تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کی پہلی اشاعت مکتبہ سات رنگ کراچی سے 1963 میں ہوئی اور اس کا ہندوستانی ایڈیشن علی گڑھ بک ڈپو علی گڑھ سے 1977 میں چھپا تھا۔ ایک طویل عرصے تک انسان اور آدمی اور ستارہ یا بادبان کے یہی ہندوستانی ایڈیشن ہی دستیاب تھے تا آنکہ یہ دونوں مجموعہ محمد حسن عسکری شائع کردہ سنگ میل کا بھی حصہ بنے۔

اس کتاب میں اٹھائیس مضامین ہیں جن کا زمانہ 1953 سے 1960 کا ہے۔ پہلے مجموعے کی نسبت اس میں مضامین کی تعداد دگنی ہے۔ لیکن اس کا دورانیہ تقریباً وہی سات آٹھ برس کا ہے۔ کراچی منتقل ہو جانے کے بعد عسکری کی توجہ فوری ہنگامی مسائل اور قومی، اجتماعی و ملکی امور سے ہٹ کر جب کچھ داخلی معاملات کی طرف ہو گئی تھی تب انہوں نے چند ایسے ادبی مباحث پر لکھنا شروع کیا تھا جن کی حیثیت ہنگامی نہیں بلکہ ایک طرف ادب، زندگی اور ادیب کی ذات میں تخلیقی سرچشموں کا کھوج لگانے اور دوسری طرف چند ایسے ادبی مسائل حل کرنے کی تھی جن کا آغاز ان کے مضمون ''انسان اور آدمی'' میں ہوا تھا۔ اس دور میں انہوں نے تخلیقی عمل کی ماہیت کو جدید نفسیات کی روشنی میں سمجھنا شروع کیا تھا اور کم و بیش اسی روشنی میں حالی اور جرات وغیرہ پر مضامین لکھے تھے۔ علاوہ ازیں اردو میں محاوروں اور استعاروں کے استعمال اور نئے و پرانے لکھنے والوں کے ہاں ان کے برتاؤ کی روشنی میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے رویوں میں ان کی اہمیت پر اشارات کیے تھے۔ اردو نثر، اسالیب بیان اور اردو میں ادبی تخلیقات کے تراجم کے مسائل پر بھی انہوں نے اسی عرصے میں زیادہ لکھا تھا۔ ''انسان اور آدمی'' میں انہوں نے جس مسئلے پر پہلے اشتراکی روس میں پائے جانے والے تصور انسان کے حوالے سے بحث کی تھی اب انہوں نے اسی پہلو کو امریکی اور زر پرست معاشروں کے تصور انسان کی روشنی میں نئے سرے سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ پیروی مغربی کی کوشش میں اردو ادیبوں کی ناکامی کے اسباب اور مشرق و مغرب کے طرز احساس کے فرق کو بھی اب وہ ایک مختلف تناظر میں دیکھنے لگے تھے۔ ان کے اسی عرصے کے لکھے ہوئے مضامین ''رومال کی زنجیر'' اور ''حکایت نے'' ان کے اندر آنے والی ان تبدیلیوں کا سراغ دے رہے تھے جن کا پہلا بھرپور اظہار ان کے مضمون ''محسن کاکوروی'' میں ہوا تھا۔ جس طرح پچھلے مجموعے انسان اور آدمی میں ادبی معاملات کے علاوہ ایک مضمون فن تعمیر سے متعلق تھا اسی طرح اب انہوں نے ''شاکر علی'' اور ''رواؤ'' پر بھی لکھا تھا اور ان مضامین کے اندر بھی بیسویں صدی کے مغربی شعور

سے الگ ہوتے جانے کی ایک زیریں لہر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کی اطلاع بھی ان کے ایک خط بنام آفتاب احمد نوشتہ 26 مارچ 1954ء میں ہے: "اب ایک کتاب تو میں نے پاکستانی ادب والے مضمونوں کی ترتیب دی ہے اور دوسری اردو شاعروں اور ماہ نو والے مضمونوں کی"۔ جیسا کہ معلوم ہے ستارہ یا بادبان میں شامل زیادہ تر مضامین "ماہ نو" کراچی میں شائع ہوئے تھے۔ اس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ عسکری کا اشارہ اسی کتاب کی طرف ہے۔ "پاکستانی ادب" والے مضامین تو معلوم نہیں کس سبب سے انہوں نے مرتب نہیں کیے، لیکن اس سے اتنا تو بہر حال ثابت ہے کہ "پاکستانی ادب" کے تصور سے وہ 1954 میں بھی دستبردار نہیں ہوئے تھے، جیسا کہ ان کے بعض معترضین تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

عسکری کی زندگی میں ان کی اپنی خواہش سے چھپنے والے مذکورہ بالا دونوں مجموعوں کے کل مضامین کی تعداد بیالیس ہے۔ حالانکہ 1939 (ان کے تحریری دور کا آغاز) کے بعد سے اب تک افسانوں اور تراجم کے علاوہ دو سو سے زیادہ مضامین ان کے قلم سے نکل چکے تھے اور مختلف رسائل و اخبارات میں چھپ بھی چکے تھے جن میں ان کے معروف کالم "جھلکیاں" کے مضامین بھی شامل تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ستارہ یا بادبان 1963 تک انہوں نے اپنی ایک تہائی سے بھی کم تحریریں چھپوائی تھیں۔ ان کے متواتر پڑھنے والے اس امر سے آگاہ بھی تھے اور مظفر علی سید نے 1963 میں ان پر لکھتے ہوئے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔(68) اپنی تحریروں کی طرف سے یہ بے نیازی ایک طرف تو عسکری کے قلندرانہ مزاج کی نشاندہی کرتی ہے اور دوسرے اس پہلو کی طرف بھی کہ اب وہ اپنی سابقہ تحریروں میں آمدہ خیالات کو مسترد کیے بغیر کسی اور منزل کی طرف رواں دواں تھے، جس کے نشان ستارہ یا بادبان کے چند مضامین میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

وقت کی راگنی

یہ کتاب عسکری کی وفات جنوری 1978 کے تقریباً ایک سال کے بعد مکتبہ محراب، لاہور سے 1979 میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں شامل مضامین کی تعداد سولہ ہے۔ کتاب کا مسودہ عسکری نے خود تیار کر کے ناشرین کتاب احمد مشتاق اور سہیل احمد خاں کے سپرد کیا تھا اور ناشرین کے مطابق اس وقت اس میں آخری تین مضمون "میرجی"، 1947ء، "احمد علی کا ایک ناول"، 1949ء، اور "ایسی بلندی ایسی پستی"، 1949ء، شامل نہیں تھے۔ اس کے فوراً بعد چونکہ اچانک عسکری کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ناشرین نے ان کے یہ پرانے مضامین بھی تبرکاً شامل کتاب کر لیے۔ آخری تین مضامین کو چھوڑ کر باقی

مضمونوں کی تحریر و اشاعت کا زمانہ 1960ء سے 1977ء تک ہے اور یہ ''سات رنگ''، کراچی، ''شب خون''، الہ آباد؛ ''البلاغ''، کراچی اور ''محراب''، لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ آخری تین مضمون قیامِ پاکستان کے زمانے کے ہیں اور ''ساقی''، دہلی، ''مخزن'' اور ''نیا ادب'' شمارہ 2، لاہور میں چھپے تھے۔ یہ کتاب بھی سنگ میل والے مجموعہ محمد حسن عسکری میں پوری شامل ہے۔

عسکری کے ادبی، مذہبی اور مغربی تہذیب و کلچر کے بارے عمومی خیالات کی تبدیلی کا وہ رخ جس کے ابتدائی آثار ستارہ و بادبان میں نظر آئے تھے، ان کے جامع ترین اسباب و نتائج کا کلی اظہار اسی کتاب کے مضامین میں ہوا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب چھپنے سے قبل اس کے کوئی آثار نہیں تھے۔ عسکری اردو کے ایک ایسے ادیب تھے جن کی تحریریں فوراً ہی چھپ جاتی تھیں اور اگلے ہی روز ان کے خیالات، آراء اور حتیٰ کہ جملے تک پوری ادبی دنیا میں مشہور ہو جاتے تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تصورِ حقیقت، روایت، مابعد الطبیعیات اور تصوف کے بارے میں ان کے مربوط نقطۂ نظر کا کامل ترین اظہار اسی کتاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ تحریریں اور ان کے خطوط ہیں، جن میں ان اسباب کا بیان ہے جو مغربی ادب سے ان کے اختلاف اور رینے گینوں سے تعارف کا ذریعہ بنے۔ ان کا ذکر ہم آگے کریں گے مگر وقت کی راگنی اپنی جگہ ایک مکمل داستان ہے۔

کتاب میں شامل ایک مضمون ''بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے'' کتابی مسودے میں آنے سے قبل ''سات رنگ''، کراچی، فروری 1961 میں چھپا تھا۔ عسکری نے اپنے یکم فروری 1961 کے ایک خط بنام عبادت بریلوی میں بتایا ہے کہ اس میں کاتب نے بڑی زبردست غلطیاں کر دی تھیں اور کچھ غلطیوں کی نشاندہی بھی کی تھی۔ اسی طرح شمس الرحمن فاروقی کے نام خط 25 فروری 1969 میں کچھ اور غلطیوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔(69) یہ مضمون جب مقالاتِ محمد حسن عسکری، ج 2 میں ''اردو کا رسم الخط ۔۔۔ ایک مابعد الطبیعیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے مدون کیا گیا تو انہی غلطیوں کے ساتھ آ گیا ہے جن کی طرف عسکری نے توجہ دلائی تھی۔ لیکن وقت کی راگنی میں جب یہ مضمون کتابی صورت میں آیا تو جیسا کہ ناشرین نے بھی ''حرفِ اول'' میں واضح کیا ہے، عسکری نے اس میں متعلقہ جگہوں پر اصلاح کر دی تھی اور مضمون میں کچھ اضافہ بھی کیا۔ لہٰذا اب وہاں یہ مضمون مستند صورت میں موجود ہے۔ لیکن یہاں وقت کی راگنی کے عنوان سے جو مضمون موجود ہے اسے پڑھتے ہوئے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس میں صفحہ 153 پر Pasting کی غلطی کی وجہ سے کچھ سطریں اوپر نیچے ہو گئی ہیں۔ غور سے پڑھنے پر انہیں درست کیا جا سکتا ہے، مگر سرسری گزرنے پر مفہوم خبط ہو جاتا ہے۔ البتہ مجموعہ محمد حسن عسکری میں

شامل "وقت کی راگنی" میں اس مقام ص 91-690 پر متن درست کر دیا گیا ہے۔

جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ

یہ مختصری کتاب عسکری کے انتقال کے دو سال بعد ان کے بھائی محمد حسن مثنیٰ نے آب حیات، عصمت مینشن میورو ڈ، راولپنڈی سے 1979ء میں شائع کی تھی اور مجموعہ محمد حسن عسکری میں بھی شامل ہے۔
اب تک جن تصنیفات کا ذکر ہوا انکی ترتیب و تدوین اور اشاعت میں عسکری کی خواہش اور ارادے کا براہ راست عمل دخل تھا۔ جدیدیت کے ساتھ ان کی ایسی تحریروں کی تدوین و اشاعت کا آغاز ہوتا ہے جن کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد چلا؛ اس لیے ان کی اشاعت کی کوئی ذمہ داری عسکری کے سر بہر حال نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ یہ کتابیں کسی طرح بھی غیر اہم ہیں۔ بلکہ یہی وہ کام ہے جس سے ان کی تنقیدی مہمات کے تنوع اور مستقبل کے منصوبوں کا بڑا حصہ ہمارے سامنے آتا ہے۔

محولہ بالا کتاب جسے ہم مختصراً جدیدیت کہیں گے دراصل ان دو چھوٹے کتابچوں کا مجموعہ ہے جو عسکری نے بصورت موجودہ اشاعت کی غرض سے تو یقیناً نہیں لکھے تھے مگر اس امکان کو رد بھی نہیں کیا تھا۔ علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کا ذکر پہلے پہل مولانا تقی عثمانی نے عسکری کی وفات کے بعد ایک تعزیتی جلسے میں کیا تھا اور پھر اس کی تفصیل اپنے ایک تعزیتی مضمون میں دی تھی:

> "میری فرمائش پر عسکری صاحب نے اردو میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ارسطو اور افلاطون سے لے کر جدید مغربی فلاسفہ تک تمام مشہور مفکرین کے بنیادی فلسفوں کو بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا تھا، اور مغرب کی فکری گمراہیوں کی ایک جامع فہرست بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کی تھی۔ انہوں نے بارہا یہ کتاب شائع کرانی چاہی مگر وہ نظر ثانی کے ارادے سے ٹلتی رہی۔ ابھی چند ماہ پہلے انہوں نے اس کی اشاعت پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ لیکن ابھی چھپ نہیں سکی تھی کہ وہ رخصت ہو گئے۔ یہ کتاب ان کے مسودات میں محفوظ ہو گی۔"

(محمد تقی عثمانی، "آہ پروفیسر حسن عسکری مرحوم"، مشمولہ نقوش رفتگاں، ص ۱۲۳)

یہ کتاب دراصل دینی مدارس کے طلباء کے لیے ایک کورس کے خاکے کے طور پر لکھی گئی تھی جس کی بنیاد پر مولانا تقی صاحب نے دارالعلوم کراچی کے طلبا کو لیکچر بھی دیے تھے۔ (70)

خود عسکری نے معروف دینی رسالے "الحق" کے مدیر کے نام ایک خط میں انہیں رہنے کہوں سے

متعارف کراتے ہوئے لکھا تھا:

"اپنی کتابوں میں انہوں (گینوں) نے سینکڑوں ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو مغرب کے لوگ اور مغرب زدہ مشرقی لوگ ادیان کے بارے میں کرتے ہیں۔ میں نے ان کتابوں کی مدد سے کوئی دو سو گمراہیوں کی فہرست مرتب کی تھی جو ہمارے یہاں بھی رائج ہو چکی ہیں اور جنہیں دور کیے بغیر انگریزی تعلیم پانے والوں کو دین کی باتیں نہیں سمجھائی جا سکتیں۔ یہ فہرست میں نے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ خیال یہ تھا کہ مولوی تقی صاحب اس فہرست کو سامنے رکھ کر اپنے طالب علموں کو ایک خاص قسم کا کورس الگ سے پڑھائیں۔ اس سلسلے میں ایک اور یادداشت شیخ عبدالواحد یحیٰ کی کتابوں کی مدد سے میں نے مرتب کی تھی جس میں یونانی فلسفے سے لیکر آج تک کے مغربی فلسفوں کی بنیادی خامیاں جمع کی گئی تھیں۔"

(مکاتیب عسکری، ص ۱۶۵)

ناشر کے مطابق عسکری نے یہ کتابچے 1971ء کے اوائل میں مرتب کیے تھے۔ جبکہ ڈاکٹر آفتاب احمد کا کہنا ہے کہ انہوں نے مجھے اس کا مسودہ جنوری / فروری 1970ء میں پڑھنے کو دیا تھا اور یہ اشاعت کی غرض سے نہیں لکھا گیا تھا۔ (71) لیکن بہر حال اپنے موضوع اور اس میں بیان کیے گئے نکات کے اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت تو تھی اسی لیے اسے عسکری کے دیرینہ دوست، مزاج شناس اور ان مسائل میں ان سے فکری ہم آہنگی رکھنے والے معروف ماہر نفسیات ڈاکٹر اجمل کے مشورے سے یکجا کر کے چھاپ دیا گیا تھا۔ اس کے شروع میں "پیش لفظ" کے تحت ڈاکٹر اجمل کا ایک بھرپور مضمون ہے جس میں کتاب کے اختصار کی وجہ سے ممکنہ طور پر پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن افسوس کہ بعض ناقابل فہم اسباب کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔

یوں تو عسکری کی ہر تحریر ہی ہمیشہ بحث و مباحثے کا موضوع بنتی رہی ہے لیکن اس کتاب نے تو سابقہ ریکارڈ ہی توڑ ڈالے۔ یہ اتنی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی کہ اس کی اشاعت کے پانچ چھ برس بعد تک اس کی سلگائی ہوئی چنگاریوں سے دھواں اٹھتا رہا تھا۔ تصور روایت کی طرف آنے سے قبل عسکری سے اختلاف رکھنے والوں میں عموماً ترقی پسند حضرات ہی زیادہ تھے مگر وقت کی راگنی اور جدیدیت کے بعد ان کے معترضین میں جدیدیت پرستوں اور مذہبی احساس رکھنے والے علما و اہل فلسفہ کا بھی اضافہ ہو گیا اور کراچی سے لے کر صوبہ سرحد تک کے ادیب اور دانش ور عسکری کے خلاف صف آرا نظر آنے لگے تھے۔ دوسری طرف ان کے ہمنواؤں کی بھی ایک فوج تیار ہو گئی۔ ان مباحث و جدال کا ایک نمونہ دیکھنے کے لیے

1980 کے بعد کے "فنون" اور "روایت"، لاہور کے شمارے ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ شمیم احمد نے "جدیدیت" سے 'جدیدیت کی فکری گمراہیوں تک' کا ایک سفر" نامی اپنے ایک مضمون میں عسکری کے ابتدائی رجحانات سے لے کر، جو 'جدیدیت' ہی کے متعین کردہ تھے، جدیدیت کو گمراہی قرار دینے تک عسکری کے ذہنی سفر کی ایک نہایت جامع تصویر پیش کی ہے۔ یوں تو یہ پورا مضمون ہی قابل مطالعہ ہے لیکن اس کا یہ اقتباس زیر بحث کتاب کے حوالے سے اہم ہے:

"'جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ' عسکری صاحب کے انتقال کے دو سال بعد شائع ہوئی۔ مجھے اس حوالے سے جس بات کی طرف توجہ دلانی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۷۶ میں مغرب سے مایوسی کا اعلان عسکری صاحب نے یوں ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ وہ اس منزل تک 'مغربی ادبیات اور فکر کے بڑے گہرے اور تقریباً ۳۵ سال کے مطالعہ کے بعد پہنچے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک پورا منصوبہ تیار کیا تھا۔ وہ مغربی فکر کی ان تمام گمراہیوں کا مطالعہ اسی طرح پیش کریں گے جس طرح انہوں نے مغربی ادب کے ادراک، اس کے جدید تجربات' اس کے علوم اور جدید انسانی حیات کو پیش کرنے کا کام انجام دیا تھا۔ عسکری صاحب نے اس کتاب میں ہر حقیقت اور صداقت میں ملاوٹ کرنے اور اصطلاحوں کو غلط معنی دے کر تصور حقیقت کو بدل دینے کی مغربی فکر کا ایک جائزہ پیش کرنے کا ارادہ 'البلاغ' کے ایک مضمون میں بھی کیا تھا اور وقت کی رائج کے کئی مضامین میں انہوں نے اس کا اظہار کھل کر کیا ہے کہ مغرب نے ادھوری صداقتوں کے ذریعے نہ صرف ساری انسانیت کو گمراہ کیا بلکہ مشرق اور مسلم معاشروں میں ان کے تصور حقیقت کو مسخ کرنے کی بھی پوری کوشش کی۔ ...یہ ایک اتفاق تھا کہ انہوں نے اس کتاب کا جو خاکہ مرتب کیا تھا اسے مولانا محمد تقی عثمانی کے بقول ان کے حوالے اس لیے کر دیا گیا تھا کہ وہ دینی علوم کے طلبا کو مغربی فکر سے واقفیت اور ان کی گمراہ کن اصطلاحات کو سمجھانے کے لیے استعمال کر سکیں۔... یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے اختصار، اشارات اور صرف نوٹس کی حیثیت سے ہونے کے باوجود اتنی اہم ہے کہ اس سے وہ لوگ کسی طرح بھی درگذر نہیں کر سکتے جن کے سامنے عسکری صاحب کا ذہنی سفر، فکری ارتقا، اور ان کے خیالات کا زمانی تسلسل رہا ہے۔ دراصل عسکری صاحب 'جدیدیت' سے جدیدیت کی گمراہی تک جو سفر کرتے ہیں وہ ان کی پوری زندگی کی صداقتوں کی داستان ہے۔"

(شمیم احمد: "جدیدیت سے جدیدیت کی فکری گہرائیوں تک"،

مشمولہ محمد حسن عسکری، ایک عہد آفریں نقاد، ص 20-219)

یہ تو ایک مکتب فکر کی رائے ہے۔ دوسری طرف کے لوگوں کے تحفظات و خدشات کی نمائندگی فیض احمد فیض کے اس خط میں ہوئی ہے جو انہوں نے افتخار عارف کے نام اس کتاب پر اپنا "تاثر" بیان کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار صفدر میر بھی اپنے کالموں میں کرتے رہے تھے۔(72)

جھلکیاں، تخلیقی عمل اور اسلوب

یہ دو کتابیں ایک ہی زمرے میں رکھے جانے کے قابل اس لیے ہیں کہ یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ جھلکیاں کے مرتب محمد سہیل عمر اور نعمانہ عمر ہیں اور یہ مکتبہ الروایت کی طرف سے 1981 میں شائع کی گئی تھی۔ تخلیقی عمل اور اسلوب کے مرتب بھی محمد سہیل عمر ہیں۔ اسے نفیس اکیڈمی کراچی نے 1989 میں شائع کیا تھا۔ اول الذکر مجموعہ محمد حسن عسکری میں شامل ہے جب کہ موخر الذکر عسکری نامہ میں رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں سے عسکری کی ان تحریروں کی تدوین اور اشاعت کا آغاز ہوا جو ہندوستان و پاکستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں بکھری ہوئی تھیں۔ جیسا کہ معلوم ہے عسکری "ساقی"، دہلی میں 1939 سے لکھ رہے تھے، لیکن یہ کبھی کبھار کا لکھنا تھا۔ 1943 میں فراق گورکھپوری، ساقی میں "باتیں" کے عنوان سے ایک کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں گاہے گاہے یہ کام عسکری کرتے تھے۔ لیکن جنوری 1944 سے انہوں نے "جھلکیاں" کے عنوان سے مستقل ماہانہ کالم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جو 1947 کے فسادات کے تعطل کے علاوہ ساقی کے کراچی منتقل ہو جانے کے بعد نومبر 1957 تک چھپتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ دوسرے رسائل میں لکھتے رہتے تھے مگر ان کے کالم "جھلکیاں" کا اردو کی ادبی و تنقیدی تاریخ میں بڑا خاص مقام ہے۔ سلیم احمد نے "جھلکیاں" کو "عسکری فکر کی تاریخ" کہا تھا، جس کی سرحدیں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کالموں میں عسکری نے جن مغربی ناموں اور ادبی رجحانوں کا ذکر کیا وہ بعد میں اردو تنقید کا مستقل موضوع بن گئے تھے۔ زیر تبصرہ دونوں کتابیں عسکری کے ان

تمام کالموں کا مجموعہ ہیں جو" ساقی" میں ماہ بہ ماہ چھپتے رہے تھے۔ "جھلکیاں" کے عنوان سے جو کتاب ہے اس میں جنوری 1944ء سے دسمبر 1948ء تک کے مضامین ہیں اور تخلیقی عمل اور اسلوب میں جنوری 1949ء تا نومبر 1957ء کے کالم شامل ہیں۔ ان کتابوں کے نام مختلف ہو جانے کی وجہ سے گمان گذرتا ہے کہ شاید یہ الگ الگ کتابیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں "جھلکیاں" کا حصہ اول اور حصہ دوئم کا نام دیا جا سکتا تھا۔ بہر حال گلاب گلاب ہی ہے، نام کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا۔ ان دونوں جلدوں میں ایک معنوی فرق ہے: جھلکیاں میں زیادہ تعداد تقسیم سے پہلے کے کالموں کی ہے جن میں ایک معروف مگر مبالغہ آمیز رائے کے مطابق، عسکری صرف ہیئت و اسلوب اور ادب کے جمالیاتی و فنی پہلوؤں ہی پر زور دیتے تھے۔ تخلیقی عمل اور اسلوب "جھلکیاں" کا پاکستانی دور کہا جا سکتا ہے، اگر چہ ستمبر 1948ء سے شروع ہونے والے چھے کالم جھلکیاں میں بھی شامل ہیں۔ اب چونکہ عسکری پر پاکستانی طرز احساس کا غلبہ ہو چکا تھا اس لیے وہ زیادہ زور شور سے انہی مسائل پر لکھ رہے تھے اور ادیبوں کو توجہ دلا رہے تھے۔ غیر ادبی مقاصد کے باوجود ادب کے فنی پہلوؤں کو کیونکر ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے سابقہ باب میں اشارہ کیا ہے، 1950ء کے بعد کچھ تو ادیبوں کی بے حسی اور کچھ حکومت وقت کے کلچر و ادب کے ناشناسی کے رویوں کے سبب عسکری کی توجہ فوری ہنگامی مسائل سے ہٹ کر نسبتاً داخلی اور فکری امور کی طرف ہوتی گئی تھی۔ اسی عرصے میں انہوں نے ادب کے جمود و موت کے مسائل چھیڑے تھے اور بقول "جمیل عمر" یہاں ان کے لہجے میں ایسے دکھ کی گونج سنائی دیتی ہے جو اپنی چہیتی اولاد کی موت کے نوحے سے جنم لیتی ہے"۔ (73) اس کے بعد ان کی توجہ کا رخ، خصوصاً "جھلکیاں" میں، اجتماعی زندگی، قاری اور لکھنے والے کے مابین تعلق، نئے تجربات سے ادیبوں کے گھبرانے کے مسائل اور اسالیب بیان و تخلیقی عمل سے اس کے ربط کے مباحث کی طرف ہوتا گیا تھا۔ اس طرح یہ وہی دور ہے جب انہوں نے انسان اور آدمی اور ستارہ و بادبان مرتب کر کے شائع کروائی تھیں۔ اس کے بعد کی کہانی وقت کی راگنی اور جدیدیت میں آئی ہے۔ "جھلکیاں" کی خاص بات وہ بے ساختہ و بے تکلف مکالماتی اسلوب ہے جس میں عسکری نے بالکل

ابتداء ہی سے زندگی اور ادب کے اٹوٹ رشتے کا اعلان کر کے اس تاثر کو غلط کہہ دیا تھا کہ وہ آرٹ اور زندگی کو الگ سمجھتے ہیں۔ سلیم احمد نے ''جھلکیاں'' کی اسی خصوصیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا تھا: ''ذرا دیکھیے کہ زندگی جیسی ان تحریروں میں نظر آتی ہے اس کی مثال اردو کا کوئی اور ادیب پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔ کیا 'جھلکیاں' پڑھ کر آپ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ آپ اپنے زمانے کی روح کا مطالعہ کر رہے ہیں؟ ہماری زندگی کیسی تھی، اب کیا بن رہی ہے اور آئندہ کیا بنے گی، اس کا جتنا احساس 'جھلکیاں' میں موجود ہے مجھے تو اردو کی کسی اور تحریر میں نظر نہیں آیا۔ انہیں پڑھ کر میری تو بینائی بڑھ جاتی ہے۔ میں اپنے آگے پیچھے زیادہ دیکھنے لگتا ہوں۔۔۔ایک ایسے زمانے میں جب ادیب یہ دیکھنا ہی بھول گئے تھے کہ ان کے ارد گرد زندگی کیا صورت اختیار کر رہی ہے۔ عسکری صاحب نے ہمیں بتایا کہ زندگی کو دیکھنے کے لیے ''زندگی، زندگی'' چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی کو اپنے اندر اور اپنے باہر دیکھنے کی ضرورت ہے، باہر سے زیادہ اپنے اندر، کیونکہ باہر کا پتہ بھی اندر دیکھنے سے چلتا ہے۔''

(پیش لفظ، جھلکیاں)

یہ تاثر بہت عام ہے کہ عسکری کی بعد کی زندگی اور تصورات ان کے سابقہ خیالات کا استرداد ہیں۔ اس میں جزوی صداقت تو ہو سکتی ہے کلی نہیں۔ انہوں نے اگر چہ اپنی سابقہ تحریروں سے بے نیازی برتی اور انہیں جمع کر کے شائع کروانے کا اہتمام نہیں کیا مگر ان سے دست برداری کا اعلان بھی نہیں کیا۔ سلیم احمد کی شہادت پر جھلکیاں کے مرتبین کا کہنا ہے کہ عسکری خود ان مضامین کو شائع کروانا چاہتے تھے۔ بہر حال ان کی بعد کی فکر کی روشنی میں ''جھلکیاں'' مستند ٹھہرتی ہیں یا نہیں، اس سے قطع نظر، یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ادب و فن کی ماہیت اور زندگی سے اس کے تعلق کے مسائل کو سمجھنے کے لیے ''جھلکیاں'' سے بہتر اور کوئی شے نہیں۔ اور خود عسکری کی ذہنی زندگی ان ''جھلکیوں'' میں یوں بکھری پڑی ہے جس طرح کسی بڑے ناول میں فنکار اپنے کرداروں کے مختلف خصوصیات اور اجزاء کو پھیلا دیتا ہے اور پڑھنے والوں پر آہستہ آہستہ ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو عیاں کرتا ہے۔ ''جھلکیاں'' پڑھے بغیر ہم ان کی ''ذہنی کردار نگاری'' کو نہیں سمجھ سکتے۔ عسکری کے معاصر ادبی مسائل اور فکری رجحانات سے ''جھلکیاں'' میں جو آگاہی ملتی ہے اس کے لطف اور ادراک کا معاملہ اس پر مستزاد ہے۔

''جھلکیاں'' کے دو چار مضامین انسان اور آدمی، ستارہ یا بادبان اور وقت کی راگنی میں پہلے بھی آ چکے تھے۔ مگر زیر بحث کتابوں کے مرتب نے نہایت سمجھداری سے کام لیتے ہوئے انہیں ان دونوں

مجموعوں میں تاریخی ترتیب سے باقی رکھا ہے۔

مجموعہ محمد حسن عسکری

جیسا کہ درج بالا سطور میں ذکر ہوا اس کتاب میں عسکری کے تمام تنقیدی مجموعوں، ماسوائے تخلیقی عمل اور اسلوب، کو جمع کر کے ان کے "تنقیدی کلیات" کی شکل دی گئی ہے۔ اس پر مرتب و مدون کے طور پر کسی کا نام نہیں ہے اور سنگ میل، لاہور نے اسے 1994 میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کے شائع ہونے سے عسکری کی دستیاب کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بھی ایک دفعہ پھر منظر عام پر آگئیں جو نایاب ہوتی جارہی تھیں اور ان میں موجود کتابت اور pasting کی بعض اغلاط کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ بجا طور پر "عسکری کا تنقیدی کلیات" ہوتا اگر محولہ بالا کتاب بھی اس میں شامل ہوتی جو عدم دستیابی یا شاید لاعلمی کے سبب مجموعے سے باہر رہ گئی ہے۔(74)

عسکری نامہ

محولہ بالا مجموعہ جس کتاب کی کمی کے سبب "کلیات عسکری" نہ بن سکا تھا، اس کتاب کو عسکری کے دونوں افسانوی مجموعوں جزیرے اور قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے کے ساتھ ملا کر، جنہیں نفیس اکیڈمی کراچی نے پہلے یکجا کر کے عسکری کے افسانے کے نام سے چھاپ دیا تھا، سنگ میل، لاہور نے 1998 میں ایک بے جوڑ سا عسکری نامہ تیار کر دیا۔ اس طرح اس کتاب میں عسکری کے تمام افسانے اور "جھلکیاں" کا وہ حصہ جو پہلے تخلیقی عمل اور اسلوب کے نام سے آیا تھا، شامل ہیں۔ تنقیدی مضامین اور افسانوں کو یکجا کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کتاب میں نفیس اکیڈمی، کراچی کی طرف سے عسکری کی شائع کردہ کتابیں جمع کرنا مقصود ہو۔

ان دونوں مجموعوں میں شامل تمام کتابوں پر ہم الگ الگ تبصرہ کر چکے ہیں۔ لہذا یہاں اتنا کہنے پر اکتفا ہے کہ مجموعہ محمد حسن عسکری اور عسکری نامہ کی عمدہ مشینی کتابت، مضبوط جلد اور دیدہ زیب گرد پوش کے ساتھ عسکری کی تنقیدی تحریروں تک رسائی آسان ہو گئی ہے۔ ہمارے زمانے میں جہاں ایک ادیب خصوصاً نقاد کو اپنی کتاب اپنی زندگی میں چھپوانے کے لیے بعض اوقات پلے سے پبلشر کو کچھ دینا پڑتا ہے وہاں ایک بڑے کمرشل اشاعتی ادارے سنگ میل، لاہور کی طرف سے عسکری کے انتقال کے ربع صدی بعد کسی کی بھاگ دوڑ کیے بغیر عسکری کے دو ضخیم مجموعے چھاپنا ایک تجارتی معاملہ بھی ہوگا،

لیکن اس سے انکی "ادبی مانگ" کا اندازہ بھی ضرور ہوتا ہے جو کسی زمانے میں بھی کم نہیں رہی۔

مقالات محمد حسن عسکری، دو حصے

عام طور پر خیال تھا کہ "جھلکیاں" پر مشتمل دونوں مجموعوں کے مدون اور شائع ہو جانے کے بعد عسکری کا کم و بیش سارا تحریری سرمایہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ مگر فی الاصل ایسا نہیں تھا۔ اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں عسکری نے بے مصرف وقت کوئی نہیں گزارا تھا۔ اس کی سب سے بڑی شہادت مقالات محمد حسن عسکری کی دو جلدوں میں ملتی ہے جن کی مجموعی ضخامت بڑے سائز کے تقریباً تیرہ سو صفحات ہے۔ ان مقالات کی تحقیق و تدوین شیما مجید نے کی ہے اور "علم و عرفان پبلشرز"، لاہور کی طرف سے 2001 میں شائع ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ مقالات میں تحقیق اور تدوین دونوں کی کمزوریاں موجود ہیں مگر شیما مجید کی محنت کی داد نہ دینا سخت زیادتی ہوگی۔

مقالات میں شامل عسکری کے مضامین کا پھیلاؤ وسعت اور تنوع ان کے ایسے قارئین کے لیے باعث حیرت ہے جس کا واسطہ اب تک صرف ان کی سابقہ دستیاب کتب سے رہا ہے۔ مقالات کی اہم ترین خصوصیت اس میں شامل عسکری کی تحریروں کا وہ طویل دورانیہ ہے جو 1942 سے لے کر 1977 تک 35 برسوں پر محیط ہے۔ ان کی کوئی دوسری کتاب اس خصوصیت میں مقالات کی حریف نہیں ہے۔ پھر بات محض زمانی وسعت ہی کی نہیں، اس کے موضوعات میں بھی وہ حیرت انگیز تنوع ہے جو عسکری کے ہر دور اور ہر ذہنی کروٹ کے نشان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس کے مشمولات میں عسکری کے معروف تصورات کی محض تکرار نہیں بلکہ بعض مضامین میں تو قاری ان کے کچھ ایسے خیالات سے آگاہی پاتا ہے جو بھولی بسری یادیں بن کر رہ گئے تھے۔ مقالات کی اشاعت سے اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم عسکری کی تحریروں کو تاریخی ترتیب سے اس طرح پڑھ سکتے ہیں جو ہمیں ان کے بارے میں عمومی طور پر قائم کی ہوئی بعض جلد بازانہ آراء میں نظر ثانی پر مجبور کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے عسکری کے "تضادات" اور بار بار رائے بدلنے کا معاملہ۔

مقالات کے شروع میں ایک "حرف تقدم" (شیما مجید) ایک دیباچہ (ڈاکٹر سہیل احمد خاں) اور ایک پیش لفظ (ڈاکٹر آصف فرخی) ہے۔ اور انہیں دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شاید ضخامت کے پیش نظر، مگر مجموعہ محمد حسن عسکری کی موجودگی میں اس جواز کی کوئی اہمیت نہیں۔ پہلی جلد کے مضامین "ادبیات" اور دوسری کے "سیاست، ثقافت، مذہب، لسانیات، تعلیم اور فنون لطیفہ" کے تحت رکھے گئے ہیں۔ لیکن بغور دیکھنے سے یہ "مقولہ بندی" پوری طرح باجواز محسوس نہیں ہوتی کیونکہ دوسری جلد کی بعض چیزیں پہلی

جلد میں جگہ پانے کی مستحق ہیں خصوصاً وہ جو "تراجم" کے ذیل میں ہیں۔ کسی بھی ایسے مجموعہ مضامین میں جہاں موضوعات میں پھیلاؤ ہو وہاں مختلف ذیلی عنوان قائم کر کے مضامین ان کے تحت رکھنا مجبوری ہوتی ہے۔ مگر ان میں تقدیم و تاخیر کا معاملہ پھر بھی کسی اصول کے تحت ہونا چاہیے۔ کسی بہتر اور مناسب اصول کی عدم موجودگی میں سب سے بہترین طریقہ تاریخی ترتیب ہوتا ہے۔ مگر مقالات میں ایسی کسی چیز کا دھیان کم ہی رکھا گیا ہے۔

اوپر ہم نے مقالات میں "تحقیق و تدوین" کی کمزوریوں کا ذکر کیا تھا۔ مفروضہ طور پر مقالات کو عسکری کے اب تک کے غیر مدون مضامین کا مجموعہ ہونا چاہیے لیکن ان میں ایسے مضامین بھی بکثرت آ گئے ہیں جو عسکری کی سابقہ کتابوں میں موجود ہیں۔ اس کا تو پھر بھی کوئی جواز نکالا جا سکتا ہے، مگر مقالات میں یہاں تک بے احتیاطی موجود ہے کہ ایک ہی مضمون کو دو مرتبہ شامل کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک مضمون "احساس قومیت اور ادیب" جو اصلاً عسکری کا لکھا ہوا "ماہ نو"، جون 1950 کا ایک "اداریہ" ہے، ایک دفعہ جلد اول میں مضمون کے طور پر دیا گیا ہے (ص 97) اور دوسری مرتبہ "کچھ اپنی باتیں" کے ذیل میں بطور اداریہ رکھا گیا ہے (ص 528)۔ اگر یہ تسلسل کلام کی خاطر تھا تو اس کی وضاحت لازم تھی۔ اسی طرح جلد اول میں عسکری کے لکھے ہوئے دیباچوں کے ذیل میں ان کا مشہور زمانہ "سیاہ حاشیے از منٹو" کا دیباچہ شامل نہیں، لیکن دوسری طرف "سخن گو" کے ذیل میں "سمندر کی تہ میں" کے عنوان سے جو تحریر "شعر و حکمت"، حیدر آباد دکن کے ماخذ سے شامل مقالات کی گئی ہے وہ کسی طرح بھی اس "محمد حسن عسکری" کی نہیں جو اردو دنیا میں بطور نقاد کے معروف ہے اور جس کے مقالات ترتیب دیے گئے ہیں۔ کیونکہ اس کی ایک ایک سطر عسکری کے اسلوب کے خلاف گواہی دیتی ہے۔ یہ ن م راشد کی ایک نظم کا تجزیہ ہے۔ اول تو نظموں یا کسی فن پارے کا اس طرح تجزیہ کرنا عسکری کا منہاج تنقید ہے ہی نہیں۔ دوسرے اس میں Myth کا ترجمہ جس طرح "خرافات" کیا گیا ہے وہ عسکری کبھی نہیں کر سکتے تھے۔(75)

اس سنگین تحقیقی غلطی کے باوجود راقم کا خیال ہے کہ مقالات محمد حسن عسکری کی جمع و ترتیب شیما مجید کا ایسا کام ہے جو اگر وہ نہ کرتیں تو نہ جانے عسکری کی ان تحریروں تک رسائی کے لیے ان کے پڑھنے والوں کو اور کتنا انتظار کرنا پڑتا۔ اس میں عسکری کے فکر و فن کے بعض ایسے گم گشتہ گوشے سامنے آئے ہیں جو کم از کم تازہ واردان بساط ادب کے لیے حیران کن ہیں۔ انہی میں سے ایک گوشہ ہے قیام پاکستان کے زمانے میں جنوبی ایشیا کے مسلم شعور کی تہذیبی معنویت اور تخلیق پاکستان کے تجربے سے عسکری کی کشید کردہ پاکستانی کلچر، پاکستانی ادب کی روح اور پاکستان و دیگر مسلمان ملکوں کے معاشی مسائل پر ان کے تجزیے۔ ایک ادیب کی حیثیت سے عسکری نے ان موضوعات پر جس طرح لکھا ہے انہی کی بعض اور

جھتوں کی طرح یہ سب کچھ ایک ''نقاد'' کی محدود ادبی سرگرمیوں سے بہت آگے کی چیز ہیں۔ اگر ہماری قوم کا تہذیبی شعور متحرک، فعال اور کارزارِ حیات کی کشمکش میں تخلیقی امنگ کے ساتھ نبرد آزما ہونا چاہے تو عسکری کے ادبی و تہذیبی فعالیت کے اس سفر میں اس کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جن کے سنگ ہائے میل مقالات میں جا بجا گڑے نظر آتے ہیں۔

یہ تو اب بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مقالات میں عسکری کی ہر غیر مدون تحریر آ چکی ہے، لیکن اتنا طے ہے کہ ان کی غیر مدون تحریروں کا وقیع ترین حصہ اب عسکری کے پڑھنے والوں کو دستیاب ہو گیا ہے۔

عسکری کے تراجم

یہ امر معلوم ہے کہ عسکری نے ابتدا جو ترجمے کیے ان کا محرک معاشی مسئلہ تھا جس نے تعلیم سے فراغت کے بعد انہیں کافی پریشان رکھا تھا۔ ان کے بھائی محمد حسن مثنیٰ کا بھی یہی کہنا ہے: "1946 اور 1947 میں (عسکری کا) مکتبہ جدید سے تعلق پیدا ہو گیا تھا اور ان کے لیے ترجموں کا کام کر رہے تھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو اندازہ ہو گا کہ آخری سلام، مادام بواری، اور سرخ و سیاہ بڑی حد تک روزی کمانے کے لیے ترجمہ کی گئیں"۔ (76) عسکری کا ایک خط بنام آفتاب احمد نوشتہ 4 فروری 1947 بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ ان کے روزی کمانے کی خاطر کیے گئے ترجمے بھی آج تک اپنی زبان و بیان کی خوبیوں اور اسلوب کی تہہ داریوں کی داد پا رہے ہیں۔ ان تراجم کی تفصیل یہ ہے۔

ریاست اور انقلاب

یہ لینن کی معروف کتاب ہے اور عسکری کا پہلا ترجمہ جو ہند کتاب گھر دہلی سے چھپا تھا۔ یہ کوئی ادبی کتاب نہیں اور نہ مترجم نے اسے کسی ایسی خوبی کی بنا پر ترجمہ کیا ہے بلکہ اسے محض گذر اوقات کا وسیلہ جان کر ترجمہ کیا تھا۔ جس زمانے کا یہ ترجمہ ہے اس دور میں عسکری ادب کے اشتراکی نقطہ نظر کے سخت خلاف تھے اور ذرا بعد اپنے مضمون "ادب اور انقلاب" میں اس نظریے پر سخت تنقید کی تھی۔ لہٰذا اس ترجمے کی حیثیت علمی و ادبی نہیں۔

میں ادیب کیسے بنا

یہ میکسم گورکی کی یادوں کے اس حصے کا ترجمہ ہے جو لکھنے والوں سے متعلق ہے۔ الجدید، لاہور کا چھپا ہوا ہے۔ مظفر علی سید کی تحقیق کے مطابق یہ پہلی مرتبہ 1943 میں دہلی سے شمشیر سنگھ نرولا نے چھاپا تھا۔ (77) مظفر صاحب کا مزید کہنا ہے کہ عسکری کے دوسرے تراجم کے مقابل اس کی کوئی حیثیت نہیں، بعد میں اسی مصنف سے عسکری کو گلے شکوے پیدا ہوئے۔ ہندو پاکستان میں گورکی کا نام چونکہ

ترقی پسند ادیبوں کے ورد زبان رہتا تھا اس تناظر میں عسکری نے اپنے مضمون "مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی" میں گورکی کی خوب بھد اڑائی ہے۔(78) روسی ادب سے عسکری کو دلچسپی ضرور تھی مگر اشتراکی ادب کے مبلغانہ جوش و خروش نے انہیں باغی کر دیا تھا۔ گورکی بھی شروع میں ایک فنکار تھا مگر انقلاب کے ریلے میں اس کے آرٹ پر تبلیغ کا غلبہ ہو گیا تھا۔ اختر حسین رائے پوری نے گورکی کی آپ بیتی کا جو سہ جلدی ترجمہ کیا تھا اس کے مقدمے میں انہوں نے انقلاب اور گورکی سے اپنی تمام تر دلچسپی کے باوجود اس طرف اشارے کیے ہیں اور آپ بیتی والے فن کار گورکی کا بعد میں تبلیغی تحریریں لکھنے والے گورکی سے امتیاز دکھایا ہے۔ عسکری کو بھی اسی فنکار گورکی سے دلچسپی رہی ہوگی ورنہ وہ لینن اور گورکی کے اصلاحی و انقلابی تصور ادب سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ اپنے 4 فروری 1947ء کے ایک خط بنام آفتاب احمد میں انہوں نے اس ترجمے کا قصہ لکھتے ہوئے کہا:

> "گورکی کیا، پیسے ملتے ہوں تو میں کوک شاستر کا بھی ترجمہ کر ڈالوں۔ ورنہ ویسے تو مجھے اس کتاب سے انتہائی اختلاف ہے کہ مجھے یہ تک یاد نہیں رہا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ نرولا صاحب چاہتے تھے کہ میں دو چار صفحے کا دیباچہ بھی لکھ دوں۔ مگر میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ نے مجھ سے دیباچہ لکھوایا تو آپ کی کتاب نہیں بکے گی۔"

(خط بنام آفتاب احمد، مشمولہ تخلیقی ادب، شمارہ 4، ص 428)

آخری سلام

یہ کرسٹوفر اشرووڈ کے Good-bye to Berlin کا ترجمہ ہے جو ایک اہم معاصر ناول کے طور پر مشہور تھا۔ اسے مکتبہ جدید لاہور نے 1948 میں شائع کیا تھا۔ اس ترجمے کے ساتھ عسکری کے ان ادبی تراجم کا آغاز ہوتا ہے، جسے ان کے پڑھنے والوں نے بہت پسند کیا تھا مگر عسکری خود اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے:

> "میں اسے اپنا کوئی کارنامہ نہیں سمجھتا۔ اشرووڈ کی یہ کتاب حقیقت نگاری کی روایت سے متعلق ہے۔ لیکن اس کی نثر موپاساں کی نثر نہیں ہے۔ اس کی زیادہ تر دلچسپی واقعات یا کردار نگاری میں ہے۔ اس کی نثر بس کام چلاؤ قسم کی ہے۔ ایسی عبارت کو اردو میں کس طرح منتقل کیا جائے اس کا طریقہ منٹو نے 1936 کے قریب اپنے ترجموں میں بتا دیا تھا۔ اب اگر آپ کو تھوڑے بہت

محاورے آتے ہوں اور ادبی نثر کو گفتگو کے لب ولہجہ سے قریب لاسکیں تو اس
کتاب کا اچھا خاصا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے ترجمے میں چاہے
میں اشروڈ کی برابری نہ کر سکا ہوں، لیکن ترجمہ پڑھنے کے بعد اصل کتاب
پڑھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جس قسم کی نثر اس کتاب کے
ترجمے کے لیے چاہیے اس کا ڈھانچہ بنانا یا تھا۔ اردو والے ترجمے میں بس اتنی
بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست ہو اور پڑھتے ہوئے ایسا لگے جیسے کتاب
اردو میں ہی لکھی گئی ہے۔''

(ستارہ یا بادبان، ص ۱۳۵)

عسکری کے نزدیک ترجمے کا مقصد محض خیالات کو منتقل کرنا نہیں تھا بلکہ جس زبان میں ترجمہ کرتا ہو اسکے اظہاری سانچوں اور اسالیب میں اضافہ کرنا تھا تاکہ پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ مترجم اور اس زبان کے لکھنے والوں کو ایک تخلیقی تجربہ مل سکے۔ آخری سلام کی اصل خوبی چونکہ واقعات وخیالات اور کردار نگاری میں ہے اور اس کا نثری اسلوب اردو زبان اور خود عسکری کے لیے کوئی چیلنج نہیں بنا تھا اس لیے وہ اسے ایسا کوئی کارنامہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ترجمے کے شروع میں عسکری کا ایک ''پیش لفظ'' ہے، جس میں انہوں نے ناول کے سیاسی وسماجی ماحول کے پس منظر میں موجود اس ''انسانی معنویت'' کی طرف اشارہ کیا ہے جو ادب وفن کا اصل موضوع بنتی ہے اور جس کی وجہ سے کوئی فن پارہ وقت کے دائرے سے ماورا ہو جاتا ہے۔

مادام بوواری

یہ ممتاز فرانسیسی ناول نگار گستاو فلوبیر کا وہ کلاسیکی شاہکار ہے جو اپنی اشاعت (1857) کے روز اول ہی سے ایک عظیم فن پارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مصنف نہ صرف فرانسیسی حقیقت نگاری کا بانی قرار پایا بلکہ جلد ہی وہ جرمن اور انگریزی ناول نگاروں کا بھی دیوتا بن گیا تھا۔ مادام بوواری سے پہلے بھی ناول لکھے جاتے تھے اور بعد میں بھی لکھے گئے مگر اس کی بے مثال نثر اور اسلوب کا ہم پلہ کوئی نہ ہو سکا۔ عسکری، جو اپنے اس سے پہلے کے تراجم پر اللہ اکبر کہہ کر بے خطر ہاتھ ڈال دیتے تھے، یہ ترجمہ شروع کرنے میں ابتداً اس لیے ہچکچاتے رہے کہ اس محنت کی داد کون دے گا! محولہ بالا خط ہی میں لکھتے ہیں: ''مادام بوواری کا ترجمہ کرنے کا تو جی چاہتا ہے مگر وہ کتاب محنت بہت لے گی اور پیسے کوئی معقول دے گا نہیں، اس لیے میں نے بھی اس کا ترجمہ شروع نہیں کیا''۔ مگر یہ پاکستان آنے سے قبل فروری 1947ء کی بات ہے۔

اکتوبر 1947ء میں پاکستان چلے آنے کے بعد انہوں نے اس پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔ ترجمے کا ڈھنگ بھی انوکھا تھا۔ کتاب پکڑ کر ترجمہ "بولنا" شروع کر دیتے اور ان کے چھوٹے بھائی لکھتے جاتے، جب کچھ صفحوں کا مسالہ ہو جاتا تو مکتبہ جدید، لاہور کو بھیج دیتے جس نے یہ 1950 میں شائع کیا۔ ان چھیوں میں جتنے دن گھر چل جاتا اتنے دن آرام کرتے یا لاہور کے سیر سپاٹے ہوتے۔ ضروریات پھر گھیرتیں تو دوبارہ ترجمہ شروع ہو جاتا۔

مادام بوواری ایک ایسا ناول ہے جو کسی مترجم کے لیے موضوع کی بہ نسبت اپنے پیچیدہ اسلوب کی وجہ سے چیلنج بنتا ہے۔ مصنف نے اس میں معنی اور تاثر آفرینی کے لیے جملوں کے آہنگ، پیراگراف کی تشکیل، مختلف قسم کے خیالات کو تقابل یا تضاد کے لیے ایک ہی جملے میں کھپانے اور حتیٰ کہ رموز اوقاف تک سے کام لیا ہے۔ ان نزاکتوں کو اردو ایسی زبان میں منتقل کرنا، جس میں زبان کی خوبی صرف سلاست اور روانی ہی سمجھی جاتی ہے، جان جوکھم میں ڈالنا تھا۔ مگر عسکری نے اپنی حد تک یہ کام کر دکھایا ہے۔ لیکن وہ اسے اپنا ایک ناکام ترجمہ کہتے تھے:

> "میرے جس ترجمے کو غور سے پڑھا جانا چاہیے تھا وہ ہے 'مادام بوواری'، یعنی ایک ناکامیاب ترجمے کی حیثیت سے۔ اول تو اس کتاب کا صحیح ترجمہ آج تک ہوا ہی دنیا کی کون سی زبان میں ہے۔ اردو بچاری تو پھر بھی بچی ہے۔ یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ اردو کے آٹھ دس ادیب مل کر اسے ترجمہ کرتے اور اس پر تین چار سال لگاتے، تب کہیں جا کر کچھ بات بنتی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کتاب میں نثری اسلوب کے جتنے مسائل سامنے آتے ہیں میں نے ان سب کو سمجھ لیا۔ اس کام کے لیے بھی سال بھر چاہیے۔ بہرحال جو دو چار باتیں میرے پلے پڑیں وہ میں نے اردو میں پیدا کرنی چاہیں۔ مثلاً ایک تو میں نے یہ کوشش کی کہ فلوبیر نے علامات اوقاف کے ذریعے جو معنی پیدا کیے ہیں ویسے ہی میں بھی کروں۔ لیکن کاتب صاحب نے سب گڈمڈ کر کے رکھ دیا۔"

(ستارہ یا بادبان، ص ۱۳۶)

ان مشکلات کا بیان کرتے وہ کہتے ہیں کہ اس سے اگر اردو عبارت کے گنجلک ہونے کی شکایت ہو تو اس کا بہترین حل یہ ہے کہ کوئی اور صاحب اس سے بہتر ترجمہ کر کے دکھائیں۔ بہرحال مادام بوواری اگر ایک ناکام ترجمہ تھا تو یہ عسکری کے اعتبار سے تھا۔ لہٰذا عظیم ناکامی! جو چھوٹی موٹی کامیابی سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ایک بات ذاتی تجربے کی بنا پر عرض ہے کہ مادام بوواری کا یہ ترجمہ پڑھتے ہوئے کم از کم اس کا کوئی انگریزی ترجمہ ہی سامنے رکھ لیا جائے تو عسکری کی محنت کی داد ہم آج بھی دیے بغیر

نہیں رہ سکیں گے۔

سرخ و سیاہ

یہ فلوبیئر ہی کے پیشرو ایک اور بڑے فرانسیسی ناول نگار استاں دال کے ناول The Red and the Black, 1831 کا ترجمہ ہے، جو عسکری نے 1952 میں کیا۔ اور مکتبہ جدید، لاہور نے 1953 میں شائع کیا تھا۔ یہ ناول اگرچہ حقیقت نگاری کے اسلوب میں ہے مگر اس میں رومانویت کی ایک زیریں لہر بھی ہے۔ اس کی بنت سماجی و سیاسی ماحول کے اندر ہے مگر عسکری نے اسے اس کی زبان و بیان اور اسلوب کی اسی انفرادیت کی بنا پر ترجمے کے لیے چنا جو ان کے خیال میں اردو کے نثری اسالیب کے لیے ایک چیلنج تھا۔ استاں دال کے اسلوب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے رومانویت کی مبالغہ آمیز رنگینی اور غنائیت کے ردعمل میں ایک ''نو طرز غیر مرصع'' کا آغاز ہوتا ہے۔ گٹھے ہوئے جملوں، خشک، مجمل اور حشو و زوائد سے پاک زبان اور اظہار کی بے ساختگی کی وجہ سے استاں دال کی نثر اتنی چابک دست ہے کہ اس نے عسکری جیسے صاحب اسلوب نثر نگار کو بھی بے حال کر دیا تھا:

> ''اس ناول نے مجھے رلا رلا دیا۔ اگر سلاست اور روانی کی بات ہوتی تو میں لیٹے لیٹے ترجمے کے پچاس صفحے روز لکھوا سکتا تھا۔ لیکن استاں دال تو کم بخت وہ آدمی ہے جو نثر کے فن کو نظم کے فن سے بڑا سمجھتا ہے... استاں دال جذبات کا تجزیہ فکر محض کی زبان میں کرتا ہے۔ اردو میں اس کی صلاحیت نہیں۔ اگر میں اس کے لیے کوئی نیا اسلوب بنانے کی کوشش کرتا تو ڈر یہ تھا کہ اردو کے نقاد پوچھیں گے یہ ناول ہے یا مقالہ! ـــ پہلی نظر میں تو استاں دال کے جملے بڑے خشک اور بے رنگ معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذرا غور سے پڑھیں تو ایک کرارا پن اور ایک ایسی چستی ملے گی جو طنز کے قریب پہنچ جاتی ہے۔''

(ستارہ یا بادبان، ص147)

عسکری نے ان فرانسیسی ناولوں کے ترجمے زیادہ تر براہ راست فرانسیسی سے نہیں بلکہ انگریزی سے کیے تھے، مادام بواری کا ترجمہ بظاہر اس کے معروف انگریزی ترجمہ Eleanor Marx-Aveling کی بنیاد پر لگتا ہے۔ اور سرخ و سیاہ کے بارے میں تو انہوں نے محولہ بالا مضمون میں اشارہ دے ہی دیا ہے کہ یہ اسکاٹ مونکریف (Scott Moncrieff) کے ترجمے سے کیا گیا ہے جس کے بارے میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اپنی تمام تر مہارت کے باوجود اسکاٹ مونکریف

جیسا بڑا مترجم بھی استاں دال کی ان اسلوبیاتی خوبیوں کو پوری طرح انگریزی میں منتقل نہیں کرسکا۔

میں کیوں شرماؤں

عسکری کے اس ترجمے کا ذکر عام طور پر ان کے تراجم کے ذیل میں نہیں ملتا لیکن ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا کہنا ہے کہ یہ انہی کا ترجمہ ہے۔وہ لکھتے ہیں:''عسکری صاحب قیام پاکستان سے قبل شیلا کزنس (Sheila Cousins) کا ناول To beg I am Ashamed میں کیوں شرماؤں کے عنوان سے ترجمہ کر چکے تھے جسے بہت بعد میں کتابستان الہ آباد نے 1959ء میں شائع کیا اور شاید عسکری صاحب کو تادم مرگ اس ترجمے کی اشاعت کی خبر نہ ہوئی۔''(79)

عسکری اپنے بے تکلف دوستوں کے نام خطوط میں عموماً اپنی ادبی سرگرمیوں اور ترجموں کا ذکر کرتے رہتے تھے لیکن ان کی کسی تحریر میں اس ترجمے کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔1959 کے بعد وہ کم از کم اٹھارہ برس زندہ رہے۔حیرت ہے کہ انہیں بھی ''اپنے'' اس ترجمے کی خبر نہ ہوئی۔مظفر علی سید نے مشفق خواجہ کے ساتھ مل کر عسکری پر مجوزہ کتاب مرتب کرنا چاہی اور اس سلسلے میں انہوں نے عسکری کی کتب، تراجم اور غیر مطبوعہ تحریروں کی جو فہرست بنائی اس میں بھی اس ترجمے کا ذکر نہیں ہے۔ان قیاسات کی بنا پر یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترجمہ عسکری ہی کا کیا ہوا ہے۔

موبی ڈک

یہ امریکہ کے معروف ناول نگار ہرمن میل ول (Melville) کے شاہکار انگریزی ناول Moby Dick کا ترجمہ ہے، جو مکتبہ فرینکلن کے اشتراک سے شیخ غلام علی لاہور نے 1967 میں شائع کیا تھا۔ موبی ڈک کے ساتھ ہی عسکری کے ادبی تراجم کا اختتام ہو جاتا ہے۔اس کے بعد انہوں نے کچھ اور تراجم تو کیے مگر ان کی نوعیت ادبی نہیں دینی اور فکری ہے۔ یہ تراجم اب مقالات محمد حسن عسکری، جلد 2 میں شامل ہیں اور کچھ کتابی صورت میں الگ سے چھپے تھے۔عسکری کے تمام ادبی تراجم میں موبی ڈک شاید واحد ناول ہے جس کا ترجمہ انہوں نے اسکی زبان، اسلوب اور نثری خوبیوں کے بجائے اسکی تہہ در تہہ کہانی یعنی اس کے موضوع کی بنا پر کیا ہے۔

موبی ڈک بظاہر ایک عظیم الجثہ وہیل مچھلی کے شکار کی کہانی ہے جس سے انتقام لینا کپتان اہاب کی زندگی کا واحد مقصد بن چکا تھا مگر اسی جنون میں وہ خود اسکا شکار ہو جاتا ہے۔ایک عجیب وغریب بحری سفر اور انسانی جذبہ انتقام کی یہ سادہ سی کہانی اپنے اندر معنویتوں کی اتنی تہیں رکھتی ہے کہ اپنی اشاعت

1851 کے بعد کچھ عرصہ بے نام رہنے کے بعد بیسویں صدی کے ربع اول سے آج تک یہ ناول دنیا کے بڑے اور امریکہ کے عظیم ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ 1920 کے قریب ڈی ایچ لارنس نے موبی ڈک پر ایک بھرپور مضمون لکھا تھا جس میں وہ اس سفر کو کبھی "روح کا بحری سفر" کہتا ہے اور کبھی کپتان اہاب کے اس البیلے جہاز کو "امریکی باشندے کی روح کا جہاز" کہہ کر اس "امریکی مزاج" کی نشاندہی کرتا ہے جسے اس نے صرف چند کلاسیکی امریکی ادب کے مطالعات سے آدھی صدی قبل بھانپ کر دنیا کو اس سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی تھی: "۔۔۔۔اور ایک پاگل جہاز میں، ایک پاگل کپتان کے زیر کمان ایک مجنونانہ متعصبانہ شکار، کس لیے؟ موبی ڈک کے لیے جو عظیم سفید وہیل ہے۔ مگر سب کے سب کیسے شاندار طریقے سے قابو میں رکھے ہوئے، تین نفیس قسم کے نائب، اور ساری مہم کس قدر عملی، کس قدر ممتاز طریقے سے عملی طور پر کام کرتی ہوئی۔'امریکی صنعت'۔"(80) اس پاگل جہاز، پاگل کپتان اور متعصبانہ شکار کا نشانہ موبی ڈک تھی، مگر امریکی صنعت کا نشانہ کون ہے؟ افغانستان؟ عراق؟ ایران؟ چلیے چھوڑیے یہ ایک الگ داستان ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ عسکری نے موبی ڈک کا ترجمہ اس کے موضوع کی بنا پر کیا تھا۔ ترجمے کے شروع میں ان کا "تعارف" اس کا گواہ ہے۔ مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ

> "سمندر کی زندگی، وہیل کے شکار کی تفصیلات، ملاحی کی اصطلاحات، اور دیگر کوائف اس میں ایسے تھے کہ استاد مرحوم (عسکری) کے اس ترجمے کو وہ حیثیت دینا مشکل ہے جو ان کے فرانسیسی ناولوں کے ترجموں کو حاصل ہے۔"

(مظفر علی سید، فکشن، فن اور فلسفہ، ص 158)

لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ عسکری کی بدولت اردو پڑھنے والوں کو اس بڑے ناول کا ایک ایسا ترجمہ میسر آیا جس پر کوئی دوسرا ہاتھ ڈالنے کی جرات آسانی سے نہ کرتا۔ عسکری کے ان تراجم کی ادبی و تنقیدی اہمیت یہ ہے کہ اپنی فن ترجمہ نگاری کی بدولت انہوں نے اردو زبان کو فرانسیسی کے چند ایسے ناولوں سے متعارف کرایا جنہیں انگریزی کی طویل نثری روایت کے باوجود کوئی انگریزی مترجم بھی ان کی تمام نزاکتوں کے ساتھ انگریزی میں منتقل نہ کر سکا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترجمے کی ان مشکلات کی وجہ سے عسکری نے اردو زبان و نثر کے اظہاری سانچوں کے بارے میں کچھ ایسے نادر خیالات کا اظہار کیا جو انہی کا حصہ تھا۔ شاید انہی مشکلات کا احساس رکھنے اور ان سے نپٹنے کی وجہ سے ان کے اپنے اسلوب تحریر کو وہ "کرارا پن اور چستی ملی جو طنز کے قریب پہنچی ہوئی ہے"۔ مغربی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے والے تو بہت سے گذرے ہیں مگر ترجموں کی وجہ سے اپنے تنقیدی شعور اور نثری اسلوب کو اس طرح ثروت مند کرنے والا سوائے عسکری کے اور کوئی نہ تھا۔

مخدوش رابطے (عسکری کا ایک نامکمل ترجمہ)

یہ Chodrelos de Laclos کے ناول Dangerous Acqaintances کا نامکمل ترجمہ ہے جو مکالمہ 5، 2000-1999 میں چھپا۔ 54-1953 میں عسکری نے اپنے مضمون ''ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے'' کے آخر میں لکھا تھا کہ ''آج کل میں شودرلو دلاکلو کا ناول ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس میں ایک نئی مصیبت ہے۔ مصنف کا لب ولہجہ اردو میں کیسے پیدا کروں۔'' جنوری 1978 میں عسکری کے انتقال کے بعد مظفر علی سید نے عسکری کے برادر خورد محمد حسن مثنیٰ سے جب اس بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا عسکری کے کاغذات میں ایک نامکمل اور بے عنوان چیز ہے جسے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ عسکری صاحب نے ادبی تاریخ کے ایک نہایت اہم ناول کا ترجمہ ایک تہائی تک پہنچ کر ترک کر دیا تھا۔ شودرلو دلاکلو کے اس نامکمل ترجمے کا مسودہ حسن مثنیٰ کے پاس راقم کو خود بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے شروع میں عسکری نے ''13-4-53 کی تاریخ اور 9 بجکر 40 منٹ رات'' کا وقت لکھا ہوا ہے۔ مظفر علی سید نے اس نامکمل ترجمے کے حوالے سے ایک نہایت معلوماتی مضمون بعنوان ''عسکری کا نامکمل ترجمہ'' (مشمولہ مکالمہ 5) لکھ رکھا ہے جس میں عسکری کے فن ترجمہ نگاری، دیگر تراجم، اور زیر بحث ناول کی نوعیت اور ترجمے کے بارے میں بہت کچھ ہے۔ ایک اہم سوال ہے کہ عسکری نے یہ ترجمہ نامکمل کیوں چھوڑ دیا؟ مظفر صاحب نے اس بارے میں قیاس سے کام لیتے ہوئے اس کا سبب عسکری کے اندر ''بڑھتی ہوئی نیک نفسی'' میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو ناول کے ایک نازک مقام کی شدت وحدت کو برداشت نہ کر سکی تھی۔ راقم کے خیال میں عسکری کے ترجمہ نامکمل چھوڑ دینے کا یہ جواز درست نہیں ہے۔ کیونکہ عسکری کے اندر ایسے مذہبی احساسات 57-1956 تک بھی نہیں تھے۔ لیکن یہ ایک لمبی بحث ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو اصل بات یہ ہے کہ عسکری یہ ترجمہ پورا نہ کر سکے تھے۔ مثنیٰ صاحب نے بعد میں یہ مسودہ مظفر علی سید کے سپرد کر دیا تھا تاکہ وہ اسے مکمل کر دیں۔

مظفر صاحب کے خط بنام مشفق خواجہ میں جہاں عسکری کے اس نامکمل ترجمے کا ذکر ہے وہاں یہ کلمات درج ہیں ''شودرلو دلاکلو کا ناول پر خطر رابطے (Dangerous Acquaintances) جس کا ایک تہائی حصہ ترجمہ کر کے نامکمل چھوڑ دیا (مسودہ میرے پاس ہے اور تکمیل کا ارادہ)''۔ لیکن وہ بھی باقی ترجمہ مکمل نہ کر سکے تھے۔ آخرکار یہ ترجمہ نامکمل حالت ہی میں مکالمہ 5 میں ''مخدوش رابطے'' کے عنوان سے چھاپ دیا گیا، جو غالباً مظفر علی سید یا مشفق خواجہ (مرحومین) کا دیا ہوا ہے۔ یہ ترجمہ 13 اپریل 1953 کو شروع کیا گیا تھا مگر ادھورا کب چھوڑا گیا، معلوم نہیں۔ اور چونکہ عسکری نے اسے خود چھپوایا

بھی نہیں تھا، اس لیے ہم نے اسے آخر میں رکھا ہے۔

Distribution of Wealth in Islam

مفتی محمد شفیع کے رسالے اسلام کا نظام تقسیم دولت کا انگریزی ترجمہ نظر ثانی پروفیسر کرار حسین، شائع کردہ مکتبہ دارالعلوم کراچی 1963ء۔

Answer to Modernism

مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب "الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ" کا انگریزی ترجمہ، نظر ثانی پروفیسر کرار حسین، شائع کردہ مکتبہ دارالعلوم کراچی، 1976ء۔

اس کتاب کے پہلے باب کے آخر میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ 59-1958 کے بعد عسکری مغربی ادب اور طرز فکر سے مایوس ہو کر تیزی سے مشرقی ادبیات، طرز احساس، تصور حقیقت و روایت اور مذہب و تصوف کی طرف مائل ہوتے گئے تھے جس کی ابتدا انہوں نے قرآن پاک کے مختلف تراجم کے تقابلی مطالعے سے کی تھی۔ اسی اثنا میں وہ مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کی کتب سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں ان کے تعلقات مفتی محمد شفیع اور دارالعلوم کراچی کے علماء سے ہو گئے، جن کے پاس وہ مختلف دینی مسائل میں رہنمائی کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان کے دینی ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے مفتی شفیع کے صاحب زادے مولانا تقی عثمانی نے انہیں بعض مذہبی کتابیں انگریزی میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ پہلے تو عسکری عذر کرتے رہے مگر پھر خود ہی اسلام کا نظام تقسیم دولت کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب کو منتخب کرنے کا ایک خاص سبب راقم کے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل سے عسکری کو ہمیشہ سے بہت دلچسپی تھی اور قیام پاکستان سے قبل و بعد انہوں نے ان مسائل پر لکھا بھی بہت تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام اور امریکی زر پرستی کے بھی وہ ہمیشہ مخالف رہے تھے۔ قیاس ہے کہ اسی پس منظر میں انہوں نے ترجمے کے لیے اس کتاب کو منتخب کیا ہوگا۔

کچھ تو اپنے ذاتی تجربے اور کچھ رینے گینوں کی کتابوں کے مطالعے سے عسکری ان عوامل کی تہہ تک پہنچ گئے تھے جو عام پڑھے لکھے اور جدید تعلیم سے آراستہ ذہنوں میں ایمانی و اعتقادی مسائل کی طرف سے تشکیک پیدا کر کے انہیں دین و مذہب سے بیگانہ بنا رہے ہیں۔ یہ عوامل اکثر ایسے مغالطوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کے اوپر عقل و منطق کا لبادہ ہوتا ہے۔ مولانا تھانوی کی کتاب الانتباہات المفیدہ ایسے ہی

منطقی مغالطوں کے ازالے اور سلیم الفطرت ذہنوں کو ان کے مقابلے کے لیے تیار کرنے کا ایک بہت عمدہ نصاب ہے، جو مولانا تھانوی کی دیگر ادبی تحریروں کی نسبت اگرچہ سادہ زبان میں ہے مگر اس کا منطقی پیرایۂ اظہار نئے ذہنوں کے لیے پھر بھی مشکل ہے۔ عسکری نے اسی لیے اس ثقہ اور راسخ الفکر کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کر کے ان جدیدیت زدگان کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب کے طور پر تیار کیا ہے جو نہ صرف اسلام بلکہ ہر مابعد الطبیعیاتی اخلاقی نظام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہیں۔ جن لوگوں نے اصل کتاب کو دیکھا ہے وہ عسکری کے اس ترجمے کی داد دیے بغیر نہ رہیں گے کہ انہوں نے "روایتی طریق استدلال اور مولویانہ منطقی بیان" کو کس مہارت سے معاصر اسلوب میں نہایت سہل کر کے بیان کیا ہے۔ کسی اور کی نہیں پرانے مدرسانہ تدریسی طریقے پر تربیت یافتہ اور منطقی و فقہی مسائل کے ایک منتہی مولانا تقی عثمانی کی شہادت ہے کہ الانتباہات المفیدہ:

> "چونکہ بہت مختصر اور اصطلاحات سے پر تھی اس لیے یہ بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن عسکری صاحب نے اس کے ترجمے میں غیر معمولی فضل و کمال کا مظاہرہ کیا ہے... واقعہ یہ ہے کہ یہ انگریزی ترجمہ مجھے اصل سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔"

(نقوش رفتگاں، ص 123)

Commentary on the Quran

مفتی محمد شفیع کی تفسیر معارف القرآن جلد اول کے کچھ حصے کا انگریزی ترجمہ، نظر ثانی پروفیسر کرار حسین، شائع کردہ مکتبہ دارالعلوم کراچی۔

1960 کے بعد مفتی محمد شفیع اور ان کے مدرسے سے عسکری کا تعلق بڑھتا گیا تھا۔ وہ انگریزی میں کسی مستند، مفصل اور روایتی نقطہ نظر سے لکھی ہوئی تفسیر قرآن کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے۔ مولانا تقی عثمانی نے ان کے سامنے جب معارف القرآن کے انگریزی ترجمے کا منصوبہ رکھا اس کام کا آغاز عسکری نے 1974-75 میں کیا۔ ہفتے بھر وہ تندہی سے تفسیر کا ترجمہ کرتے، جمعے کے دن بعد از مغرب تقی عثمانی اور ایک اور ساتھی عبدالوحید قریشی ان کے پاس بیٹھ کر مسودے پر نظر ثانی کرتے۔ ترجمے میں عسکری اتنی مشقت اٹھاتے کہ جتنے انگریزی اور فرانسیسی تراجم ان کے پاس تھے ان سب سے متعلقہ آیات کا ترجمہ ترتیب وار ایک کاپی میں لکھ لیتے تاکہ سارے تراجم ایک نظر میں سامنے آ جائیں۔ وہ سگریٹ کے اتنے عادی تھے کہ کلاس روم میں بھی اس کا اہتمام کر لیتے تھے مگر تفسیر کے دوران وہ گھنٹوں بنا سگریٹ پیے کام کرتے رہتے تھے۔ وہ مفتی شفیع کی اس بات کو خاص طور پر دہرایا کرتے کہ قرآن کریم

ختم کرنے کی چیز نہیں بلکہ ایسی چیز ہے جس میں عمر ختم کردی جائے۔تقی عثمانی کا کہنا ہے "اللہ نے ان کی یہ نیت ایسی قبول فرمائی کہ یہی کام کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو گئے"۔

ابھی قرآن کریم کا سوا پارہ اردو تفسیر کی پہلی جلد کا دو تہائی حصہ اور انگریزی مسودے کے تقریباً پانچ سو صفحے ترجمہ کر پائے تھے کہ ان کا بلاوا آ گیا۔جیسا کہ ہم نے بتایا ابتدائی دور میں انہوں نے ترجمے کا کام روزی کی خاطر شروع کیا تھا مگر تقی عثمانی کا کہنا ہے کہ عسکری نے میرے اصرار کے باوجود تفسیر کے ترجمے کا کوئی معاوضہ یا ہدیہ لینا گوارا نہ کیا اور معارف القرآن اردو کی آٹھ جلدیں بھی دام دے کر خریدی تھیں۔

اپنے اچانک انتقال سے پہلے انہوں نے جو آخری ترجمہ کیا تھا وہ یہ مشہور آیت ہے:

"وہ (صبر کرنے والے) کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"

(البقرہ156)(81)

افسانہ نگاری،1939 سے لے کر ترجمہ تفسیر 1978 تک عسکری کا سفر زمانی اعتبار سے صرف چہل سالہ عمر عزیز کا سفر ہے مگر درحقیقت یہ زمین سے آسمان تک کا سفر ہے۔

"جسم خاک از عشق بر افلاک شد"

تراجم پر عسکری کی نظر ثانی

لال نشان

یہ امریکی مصنف نتھانیل ہاتھورن کے مشہور ناول Scarlet Letter, 1850 (حرف سرخ) کا اردو ترجمہ ہے۔

بڈھا گوریو

یہ فرانسیسی حقیقت نگار اونورے دبالزاک (Honore de Balzac) کے سب سے اہم ناول (Pere Goriot) کا اردو ترجمہ ہے۔

سرد ویران اندھیرا گھر

یہ بھی بالزاک کے ایک اور ناول Eugenie Grandet کا اردو ترجمہ ہے۔

کپتان کا گڈا

ڈی ایچ لارنس کے ناولٹ Captain's Doll کا اردو ترجمہ ہے۔

یہ چاروں تراجم عسکری کی ایک ذہین اور ہونہار شاگرد سیدہ نسیم ہمدانی کیے ہوئے ہیں جو عسکری کی نظر ثانی اور مشورے سے چھاپے گئے تھے۔

اول نشان با تصوران کا مشہور ترین ناول ہے جسے ڈی ایچ لارنس نے "جنسی معنویت کی ایک ذہنی کہانی، ایک تمثیل" کہا تھا جو ایک سطح پر "شعور اور گناہ" سے بحث کرتی ہے اور دوسری سطح پر عورت اور امریکی روح کی تباہ کاری کا مثالیہ ہے۔ اسی دوہری معنویت کی بنا پر یہ ناول آج بھی بامعنی ہے۔

بالزاک کے ناول سرد و ویران اندھیرا گھر (Eugenie Grandet, 1833) اور بڑھا گوریو (Pere Goriot, 1835) اس بے رحم سماجی حقیقت نگاری کے نمائندہ ہیں جو سائنسی طریق کار کا اطلاق ادب وفن پر کرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ بالزاک کے دل میں سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنے سماج اور انسانی زندگی کا مطالعہ حیاتیات کے ٹھوس علمی اصولوں پر کرے۔ وہ حقیقت کا دلیرانہ مشاہدہ کرنے اور جذبات کی رو میں نہ بہنے کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک ناول نگار بھی ایک سائنس دان تھا جو نہایت بے دردی سے انسانی کردار اور سماجی رویوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان رویوں کو اس نے "طربیہ انسانی" قرار دیکر اپنی اگلی پچھلی تمام تحریروں کو اسی وسیع عنوان کے تحت رکھا تھا۔ زیر بحث دونوں ناولوں میں بھی یہی ڈرامہ کارفرما ہے جن کے عنوان ان ناولوں کے مرکزی کرداروں کے نام پر رکھے گئے ہیں: "یوجینی گراندے" اور "گوریو"۔ اپنی تحریروں میں بالزاک جہاں کرداروں کی نشوونما پر توجہ دیتا ہے وہاں گردوپیش کے ماحول کے بیان کو بھی خاص اہمیت دیتا ہے۔ یہ خصوصیت ان دونوں ناولوں میں موجود ہے جس کے ذریعے اس نے ایک طرف اپنے زمانے، ماحول اور فرانسیسی سماج کے مختلف طبقوں کا ایک نگارخانہ تیار کر دیا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی پیچیدگی، رنج والم، نیکی بدی اور خودغرضی و بے غرضی کا ایسا امتزاج پیدا کیا ہے جس میں خیر وشر کے عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے بالزاک کے اندر تلخی، زہرخندگی اور حسرت و مایوسی کا ایک طوفان برپا تھا۔ عسکری کو بالزاک کے اندر رنج والم اور طرب ونشاط کی یہ جنگ بے طرح لبھاتی رہی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ایک ذہین شاگرد سے بالزاک کے یہ دو ناول ترجمہ کرائے تھے۔

ایسا ہی معاملہ ڈی ایچ لارنس کے ناولٹ کپتان کا گڈا کا ہے۔ اپنے ابتدائی تنقیدی دور میں لارنس کے بارے میں عسکری کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی مگر 1955-56 میں انہوں نے لارنس کو ایک طرح

سے دوبارہ "دریافت" کیا تھا اور جوئس اور والیری پر ترجیح دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کا تنقیدی کارنامہ اس کے تخلیقی کارنامے کے ساتھ والیری سے بھی زیادہ گستردہ ہے اور یہ کہ لارنس وہاں سے آغاز کرتا ہے جہاں جوئس ختم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نے اس کا مطالعہ نہیں کیا تو" آپ اپنے زمانے کے تاریک لمس سے آشنا نہیں ہو سکتے"۔(82) نئی تہذیب کی ہولناکی اور مرد وعورت کے تعلق پر لارنس نے اپنی تنقیدی تحریروں میں جس بصیرت کا اظہار کیا ہے اس کا تخلیقی جوہر بھی بجلیاں اپنے ناولوں اور کہانیوں کے ذریعے محسوسات تک میں بھر دیتا ہے۔ کپتان کا گڈا بھی مرد اور عورت کے تعلق کی ایک بے مثال کہانی ہے۔ عجب نہیں کہ لارنس سے اپنی اسی بڑھتی ہوئی رغبت کے پیش نظر عسکری نے اسکا یہ ناول اپنی اس شاگردہ عزیزہ سے بطور خاص ترجمہ کرایا ہو۔

1950ء میں اسلامیہ کالج کراچی میں جانے کے بعد عسکری نے اپنے شاگردوں کو نہ صرف ادب کا پختہ کار قاری بنا دیا تھا بلکہ انہیں لکھنے لکھانے پر بھی مائل کر دیا تھا۔ نسیم ہمدانی ان کے تمام شاگردوں میں مغربی فکشن سے اپنی خصوصی دلچسپی کی بنا پر سب میں ممتاز تھی اور اپنی تعلیمی قابلیت، ذہانت اور ذوق ادب کی بنا پر اس نے جلد ہی اپنے استاد کی نظروں میں خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ عسکری کو اس کی صلاحیتوں پر اور اسے استاد کی رائے پر بے حد اعتماد تھا جس کا اظہار بڈھا گوریو کے ترجمے پر عسکری کے دیباچے سے بخوبی ہوتا ہے۔ اسی اعتماد کی وجہ سے انہوں نے "کپتان کا گڈا" کا ترجمہ بھی اپنی عزیز شاگردہ سے کرایا، اس پر نظر ثانی کی اور پھر خود نیا ادارہ والوں کو چھپنے کے لیے بھجوایا تھا۔

مغرب کے شاہکار فرانسیسی اور انگریزی ناولوں کے ترجمے کرنے اور اپنی ایک شاگردہ کو تندہی سے اس کام پر لگانے کے اس سارے عمل کے پیچھے عسکری کی جو دھن تھی وہ ترجموں کے ذریعے اپنے ادب میں نہ صرف وسعت پیدا کرنے کی غرض سے تھی بلکہ اس کے ذریعے وہ اپنے ادب کے تخلیقی جوہر کو جلا دینا چاہتے تھے۔ اس احساس کے پیچھے ان کا یہ پختہ عقیدہ کارفرما تھا:

> "جو دور تخلیقی ادب کے لحاظ سے عظیم ہوتا ہے وہ ترجموں کے لحاظ سے بھی عظیم ہوتا ہے یا تخلیق کا دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے۔"

(ستارہ یا بادبان: ص 139)

انتخاب از عسکری

میری بہترین نظم، 1942

میرا بہترین افسانہ، 1943

اپنے دورِ افسانہ نگاری کے عین عروج اور تنقیدی دور کے تقریباً آغاز میں عسکری نے "نئے ادب" کے دو انتخاب شائع کیے تھے: ایک نظم کا دوسرا افسانے کا۔ اور یہ دونوں انتخاب بالترتیب کتابستان، الہ آباد سے 1942 اور ساقی بک ڈپو، دہلی سے 1943 میں شائع ہوئے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا "نئے ادب" سے مراد ان ادبی سرگرمیوں سے جنم لینے والا ادب تھا جو 1930 کے عشرے میں عالمی ادبی تحریکوں اور بین الاقوامی، سیاسی، سماجی و اقتصادی حالات اور دو بڑی جنگوں کی لائی ہوئی مادی و اقداری تباہی کے دور میں، خصوصاً ہندوستان میں جمال پرستی کی فضا کے ردِعمل میں شروع ہوئی تھیں۔ اس ادب میں ابھی ترقی پسندی و غیر ترقی پسندی کی تقسیم بھی اتنی واضح نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں عسکری کے ان دونوں انتخابوں میں اس زمانے کے وہ اکثر اہم نام شامل ہیں جو آگے چل کر ترقی پسند و غیر ترقی پسندوں میں بٹ گئے تھے۔ ان انتخابوں کے عنوان میں "میری / میرا بہترین" سے مراد انتخاب کنندہ کی / کا بہترین نظم / افسانہ نہیں بلکہ وہ تخلیقات ہیں جو اپنے خالقوں کی نظر میں بہترین یا کم از کم نسبتاً بہتر تھیں۔ عسکری نے صرف یہی نہیں کیا کہ شاعروں اور افسانہ نگاروں کی نظر میں ان کی بہترین تخلیقات منتخب کر دیں بلکہ انہوں نے کوشش کر کے تخلیق کاروں سے ان کے ذہنی سفر کے مختصر حالات بھی لکھوا کر شامل انتخاب کیے تھے۔ اس طرح بقول ان کے ایسا مجموعہ (بصورتِ نظم) تیار ہو گیا تھا "جس میں آپ صرف شاعروں ہی کی تصویریں نہیں بلکہ پوری نئی نسل کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔"

ان دونوں انتخابوں کے شروع میں عسکری کے لکھے ہوئے دیباچے بھی شامل ہیں، جن میں نہ صرف ان مجموعوں کی ضرورت اور جواز پر بات ہے بلکہ اس زمانے کے ادبی حالات، پس منظر، نئی ادبی حسیت کی نوعیت، نئی نسل کے شعور میں آنے والی ان معنوی و ہیئتی تبدیلیوں کے تعین اور نظم و افسانے کے فن کے

بارے میں عسکری کے تنقیدی خیالات بھی بڑی واضح شکل میں موجود ہیں۔ ان دیباچوں کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس وقت عسکری ابھی باقاعدہ "نقاد" بھی نہیں بنے تھے اور ادبی و فنی مسائل پر ان کی آرا ایک آدھ تحریر کو چھوڑ کر صرف جزیرے کے "اختتامیہ" میں ہی سامنے آئی تھیں۔

اس دور کے عسکری کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے (اور ان کی تحریروں کا ادھورا مطالعہ بھی اس تاثر کو جنم دیتا ہے) کہ وہ صرف "ادب برائے ادب" کے قائل تھے اور غیر فنی معیارات و اقدار سے صرف نظر کرتے تھے۔ لیکن نظم والے انتخاب کے دیباچے میں تو انہوں نے واضح طور پر لکھا تھا کہ "شاعر ایک خلا میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ معاصرانہ زندگی کی حقیقتیں انہیں پیدا کرتی ہیں"۔ انہوں نے ان حقیقتوں کی نوعیت بھی واضح کی ہے جس نے نئی نسل کی نئی حسیت کو پرانی نسل سے الگ کر دیا تھا۔ اس اعتبار سے میرا بہترین افسانہ کا پیش لفظ زیادہ تنقیدی اور لہٰذا زیادہ جامع ہے۔ اس میں جزیرے کے "اختتامیہ" والے شکست و ریخت کے سُر اور انسانی اقدار کے خاتمے کے نوحے بھی سنائی دیتے ہیں اور اجتماعیت پرستی سے ادب و آرٹ کو پہنچنے والے ان ممکنہ خطرات کی بھی پیش بینی ہے جن کا تفصیلی اظہار وہ بعد میں "جھلکیاں" میں کرنے لگے تھے۔ عسکری کے ہاں "ادب برائے ادب" کے اگر کچھ آثار تھے تو وہ اسی "اجتماعیت پرستی" کے پس منظر میں تھے جو ادیب اور فنکار کو اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اس معنی میں وہ فنکار کے لیے ایک "روحانی جلاوطنی" کو ضروری قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ کہنا بھی اسی پس منظر میں تھا کہ "آرٹ اپنی ماہیت کے لحاظ سے کسی خیال، کسی نظریے کی خدمت نہیں کرتا (بلکہ) صرف اپنی"۔۔۔۔ اجتماعیت پرستی آرٹ اور جمالیات کو بالذات اہم نہیں سمجھتی بلکہ صرف اسی حد تک جس حد تک وہ اس کے مقاصد کا خادم بن سکے۔ اس تناظر میں عسکری کہتے تھے کہ "میں صرف ایک چیز کا خادم ہوں، اپنے آرٹ کا"۔ آرٹ کی بے وقعتی کے زمانے میں وہ اس انتہا پسندی کو ضروری سمجھتے تھے۔ وہ اس میں دوسری فضولیات و آلائشوں کی آمیزش بھی برداشت کرنے کو تیار تھے مگر اس شرط پر کہ "سب سے پہلے اسے آرٹ ہونا چاہیے"۔ (83) ان امور کے پیش نظر عسکری کے یہ انتخاب اور ان پر لکھے گئے دیباچے ہر اس پس منظر میں بامعنی ہیں جب آرٹ کی جمالیاتی قدر کو کسی بھی آڑ میں گھٹائے جانے کا خطرہ ہو۔

طلسم ہوش ربا

ہماری پرانی داستانوں میں طلسم ہوش ربا کی معنویت پرکھنے کے کئی اعتبارات ہو سکتے ہیں۔ عسکری نے اس طویل داستان کا یہ انتخاب ایک خاص معیار اور پس منظر میں کیا تھا۔ مکتبہ جدید لاہور سے

1953 میں شائع ہونے والے اس انتخاب کے شروع میں عزیز احمد کا لکھا ہوا ایک ''مقدمہ'' ہے اور پھر عسکری کا ایک ''دیباچہ''۔ اس انتخاب کو جابجا حنیف رامے کی بنائی ہوئی تصویروں سے بھی مزین کیا گیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے اردو زبان، خصوصاً اردو نثر کے مختلف اسالیب اور اظہاری سانچے عسکری کے لیے وجودی دلچسپی کی چیز تھے۔ نثری اسالیب پر انہوں نے یوں تو 53-1952 کے عرصے میں لکھنا شروع کیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر اور ہمارے ادیبوں کے ہاں اردو نثر کے بارے میں پائے جانے والے رویوں سے عسکری کو جمال پسند رومانوی ادیبوں اور ''نئے ادب'' کی تحریک کے دور ہی سے دلچسپی تھی۔ اس پس منظر میں وہ ''نئے ادب'' کے اہم ترین کارنامے کو دو سطحوں پر سراہتے تھے: ایک موضوعاتی اور دوسرے اسلوبی سطح پر۔ پہلی سطح پر ''نئے ادب'' کی خدمت وہ یہ سمجھتے تھے کہ عورت، حسن اور عشق کے بارے میں جمال پرستوں کے خیالی افسانوں اور تخیل کی غیر حقیقی اڑانوں سے نکل کر ''نئے ادب'' نے ہمارا تعلق زندگی اور معاشرے کے حقیقی مسائل و مواد سے جوڑ دیا تھا۔ اور اسلوبی سطح پر وسیلہ اظہار کے طور پر اس نے جو زبان اور نثر اختیار کی وہ عام بول چال اور روزمرہ معاشرت کی زبان تھی۔ جبکہ اس کے برعکس جمال پرستوں کی نثر عامۃ الناس کی زبان سے الگ ایک شاعرانہ رنگین بیانی کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ اس مسئلے کا تجزیہ انہوں نے اپنے مضمون ''نیا افسانہ اور سماجی ذمہ داری''، مشمولہ جھلکیاں، میں کیا تھا۔ انہوں نے اس مسئلے پر پرانی داستانوں، سرسید تحریک، جمال پسندی اور نئے ادب کی تحریک کے پس منظر میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ ہماری پرانی داستانوں میں لکھی جانے والی نثر عام روزمرہ اور محاورے کی وہ زبان تھی جو اس معاشرت کی پوری عکاسی کرتی تھی۔ لیکن رومانوی ادیبوں نے اس نثر سے اپنا رشتہ توڑ کر ایک خیالی دنیا آباد کر لی تھی۔

1952 کے بعد انہوں نے اردو کے نثری اسالیب پر جب فکشن کے تراجم کے پس منظر میں نئے سرے سے بحث کرنی شروع کی تو اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے طلسم ہوش ربا کا یہ انتخاب شائع کیا تھا جس پر وہ اپنے زمانہ لاہور ہی میں کام کر رہے تھے۔ اس انتخاب میں ان کا خصوصی معیار یہ رہا ہے کہ ہماری داستانوں، خصوصاً طلسم ہوش ربا میں جادو اور ساحری سے قطع نظر ان داستان نگاروں کے ہاں عام زندگی سے تخلیقی دلچسپی کس قدر تھی، زندگی، تمدن اور معاشرت کے کتنے گوشوں پر ان کی نظر تھی اور سماج کے عام طبقوں سے لے کر محلات کے باسیوں تک میں ارتباط کتنا تھا اور سب سے بڑھ کر زندگی کی توانائیوں سے اُن کا ربط کتنا تھا۔ پھر زبان اور نثر کا استعمال وہ کیسے کرتے تھے۔ یہ آخری عنصر عسکری کے نزدیک اتنا بنیادی اور اہم تھا کہ وہ اسے زندگی اور تمدن کی تسخیر کا واحد آلہ سمجھتے تھے۔ اس انتخاب سے وہ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ زندگی سے یہ تخلیقی دلچسپی ہمارے پرانے لکھنے والوں میں انگریزی اثرات آنے

سے پہلے بھی موجود تھی۔ وہ صرف خیالی طلسماتی قصے ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ گردوپیش کی معاشرتی زندگی کو زندہ مرقعوں کی صورت میں مجسم بھی کر سکتے تھے۔ اس سماج کے مختلف طبقات کے درمیان ربط وارتباط کا نظم اس زبان اور نثر کی بنا پر تھا جس کی تہداریوں میں تمام رنگ اور آہنگ موجود تھے مگر افسوس کہ زبان کا یہ تخلیقی استعمال نئی تعلیم پانے والوں نے اپنی بے بصری کے سبب گم کر دیا ہے۔

عسکری کے اس انتخاب پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ اس میں ان جادوئی اور طلسماتی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو پرانی داستانوں کی جان تھے۔ لیکن یہ اعتراض عسکری کے معیار انتخاب سے صرف نظر کرنے کا نتیجہ ہے۔ فکشن کے فن سے عسکری کی دلچسپی، ان کی اپنی افسانہ نگاری اور ترجمہ کاری کو دیکھتے ہوئے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اگرچہ وہ فرانسیسی علامت نگاروں سے لے کر سرریلزم تک کی تحریکوں سے بھی متاثر تھے مگر "حقیقت نگاری" کی روایت کو وہ فکشن کے فن اور فلسفے کا جزو اعظم مانتے تھے، اور یہی شے اس انتخاب میں بھی منعکس ہے۔

انتخاب میر

تمام اردو شاعروں میں عسکری کی دلچسپی کا گراف شروع سے آخر تک اگر کسی کے بارے میں مسلسل برقرار رہا ہے تو وہ میر ہے۔ وہ میر کو اردو زبان اور شعری روایت کا کامل ترین نمائندہ سمجھتے تھے۔ ان کی میر شناسی ایک ایسا موضوع ہے جس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے جس میں ایک طرف میر کی انفرادیت کے وہ پہلو سامنے آسکتے ہیں جو اردو تنقید میں عسکری کے زیر اثر نمایاں ہوئے اور دوسری طرف جس میں ان کے مزاج، شخصیت اور فن کا بنیادی جوہر پیش کیا جا سکتا ہے۔

عسکری نے میر پر مسلسل اور انتھک طریقے پر لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں میر کے اشعار جا بجا نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی طبع میر پسند کی تسکین اتنے پر نہ ہوتی تھی، لہٰذا انہوں نے میر کا ایک چھوڑ دو دفعہ مفصل اور جامع انتخاب کیا تھا۔ پہلی دفعہ اس وقت جب لاہور میں وہ ابھی فراغت مگر تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ انتخاب کہیں پریس میں ادھر اُدھر ہو گیا تھا۔ بعد میں انہوں نے ایک دفعہ پھر یہ وقیع کام کیا جو "ساقی" کراچی کے میر نمبر میں 1958ء میں چھپا تھا۔ اس انتخاب کے معیار کے سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے:

> "عسکری صاحب نے ایک مخصوص اور محدود نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے میر کے بہترین اشعار کی جگہ میر کی مکمل یا اگر مکمل نہیں تو نمائندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح میر کے بہت سے عمدہ اشعار کے ساتھ کم عمدہ اشعار

بھی انتخاب میں آ گئے ہیں''۔

(فاروقی، تمہید شعر شور انگیز، ص16)(84)

اس طرح عسکری کے اس انتخاب میر کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس میں میر کے کسی پہلو کو چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے ہر رنگ کا نمونہ دیا ہے۔

غزل

یہ فراق گورکھپوری کی غزلیات کا ایک انتخاب ہے جو ناصر کاظمی نے کیا تھا اور جسے نیا ادارہ، لاہور نے 1971ء میں شائع کیا تھا۔ اس پر ''نظر ثانی محمد حسن عسکری'' چھپا ہوا ہے۔ مشفق خواجہ کے نام اپنے خط میں مظفر علی سید کا کہنا ہے: ''پوچھنے پر عسکری نے 'نظر ثانی' کے دعوے کو قبول نہیں کیا۔'' عسکری کے بھائی حسن مثنیٰ نے بھی مظفر صاحب کی اس بات کی تائید کی ہے۔ البتہ ان کا یہ کہنا ہے کہ اس انتخاب میں فراق کی جو تصویر چھپی ہے وہ یقیناً عسکری ہی کے توسط سے ہے۔

عسکری کی مدیرانہ سرگرمیاں

شریک مدیر "ساقی"

شاہد احمد دہلوی سے عسکری کا تعلق بہت پرانا تھا۔ یو پی میں "ساقی" واحد ادبی پرچہ تھا جو ایک طرف "نئے ادب" کا بھی آرگن اور دوسری طرف تحریک پاکستان کا بھی کھلے بندوں ساتھ دیتا تھا۔ "ساقی" کے مدیر شاہد احمد دہلوی نہ صرف خود ایک صاحب طرز ادیب تھے بلکہ ان کے توسط سے ماہنامہ "ساقی" اور ساقی بک ڈپو، دہلی، شمالی ہندوستان میں نئے ادب کے فروغ کا ایک مضبوط مرکز بن گیا تھا۔ "ساقی"، اور مدیر "ساقی" سے عسکری کا تعلق دہلی میں قائم ہوا تھا۔ ان کا مستقل کالم "جھلکیاں" اسی جریدے میں کم وبیش 12 برس مسلسل چھپتا رہا تھا۔ اسی تعلق کی بنا پر انہیں "ساقی" کا شریک مدیر بھی بنا دیا گیا۔

مئی 1947 کے بعد تقسیم ہند اور فسادات کی وجہ سے "ساقی" کی اشاعت کچھ عرصے کے لیے معطل ہو گئی تھی۔ پاکستان میں آنے کے بعد شاہد احمد دہلوی نے یہاں سے "ساقی" کے نئے دور کا آغاز کرنا چاہا تو شروع میں تحریک پاکستان کے لیے اپنی خدمات کے باوجود اسے مشکلات کا سامنا رہا۔ آخر ستمبر 1948 میں اسکا کراچی سے اجرا ہوا۔ عسکری نے بھی "جھلکیاں" کا رکا ہوا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ فروری 1950 میں وہ خود بھی کراچی چلے گئے۔ وہ ساقی کے "قلمی معاونین" میں تو تھے ہی "شریک مدیر" کے طور پر بھی کام کرتے رہے ہیں اور دوست احباب سے اس کے لیے مسلسل نگارشات طلب کرتے۔ 1958 کے ایوبی مارشل لاء کے تحت قائم ہونے والے "رائٹرز گلڈ" میں شاہد احمد دہلوی کی سرگرمیوں کی وجہ سے عسکری اپنے اس پرانے کرم فرما سے کچھ کھنچ سے گئے تھے مگر "ساقی" سے ان کا تعاون جاری رہا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شاہد احمد دہلوی نے سوویٹ ادب کے خلاف ساقی کا ایک ضخیم روسی ادب نمبر نکالا تو عسکری اس پر بہت نالاں ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاہد صاحب نے یہ کام امریکیوں کے اشارے پر کیا ہے۔ اس کے بعد شاہد صاحب سے ان کے تعلقات میں سرد مہری آ گئی۔ اپنا مستقل کالم "جھلکیاں" تو وہ اس سے پہلے ہی ختم کر چکے تھے، اگست 1959 کے بعد انہوں نے

1948-49 میں جب عسکری ابھی لاہور ہی میں تھے اور ''عسکری منٹو اتحاد'' کے قصے زبان زد عام وخاص تھے، ان دونوں ادیبوں نے مل کر'' اردو ادب'' کے نام سے ایک نیا ادبی رسالہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا جس کی نشر واشاعت کی ذمہ داری مکتبہ جدید، لاہور نے قبول کی۔ دنیائے ادب میں شاید ہی کسی رسالے سے منسوب اتنی کہانیاں اڑی ہوں جتنی اس جریدہ وعالم کی تھیں۔ اس ہنگامہ خیز رسالے کے یوں تو دو ہی شمارے شائع ہو سکے تھے مگر 1949 میں اس کے پہلے شمارے کے منصۂ شہود میں آنے سے پہلے ہی فضا میں جو گرد اڑ رہی تھی اس کا سب سے نمائندہ اظہار منٹو کے نام احمد ندیم قاسمی کے اس مشہور کھلے خط سے ہوا جو سنگ میل پشاور میں 15 ستمبر 1948 کو چھپا تھا۔(85) اردو ادب کے پہلے شمارے کے اداریے میں منٹو اور عسکری نے ان تمام افواہوں، کہانیوں، سازشوں اور رکاوٹوں کی طرف اشارے کیے تھے جن میں ترقی پسندوں سے لے کر حکومت وقت تک نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔

> '' اردو ادب' شائع ہوتا تو دور رہا، ابھی پوری طرح مرتب بھی نہیں ہوا تھا کہ دنیائے ادب میں ایک افسانہ بن گیا۔ کسی کو خطرہ پیدا ہوا کہ رجعت پسندوں کا محاذ بن رہا ہے۔ کسی کو دھڑکا ہوا کہ یہ کوئی پیری مریدی کا سلسلہ ہے۔ کسی کو پتہ چلا کہ یہ رسالہ پاکستان کی حکومت کا ایجنٹ ہوگا۔ اسی رسالے کے دم سے اردو میں ایک نئی صنف ادب 'کھلے خط' کا اضافہ ہوا، غرض لوگ طرح طرح سے کھلے''۔

(اردو ادب، شمارہ اول، اداریہ)

یوں تو یہ پورا اداریہ ہی ایک شاہکار تھا مگر اپنوں پرایوں کے خدشات اور عسکری ومنٹو سے منسوب سازشوں کا سب سے اہم نمونہ'' اردو ادب'' شمارہ دوم کے حصہ خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس پرچے کے صرف دو شمارے ہی شائع ہو سکے تھے: پہلا 1948 کے آخر یا 1949 کے شروع میں اور دوسرا 1950 میں؛ لیکن اپنی اہمیت اور ہنگامہ خیزی کے اعتبار سے یہ دو شمارے اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں بے مثال نقوش ثبت کر گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ترقی پسندوں اور منٹو و عسکری کے مابین جو کھینچا تانی ہوئی تھی اس کی تاریخ ان دو ادیبوں کی زیر ادارت نکلنے والے اس پرچے کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

''ماہِ نو''، کراچی

جیسا کہ سوانحی باب میں ذکر ہوا قیامِ پاکستان کے بعد عسکری نے تقریباً ڈھائی برس لاہور میں ہی قیام کیا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان کا دارالحکومت کراچی تھا جہاں اپریل 1948 سے وزارتِ اطلاعات ونشریات کا ادبی مجلّہ ماہِ نو نکلنا شروع ہوا تھا۔ وقار عظیم اس کے پہلے ایڈیٹر تھے، اور فروری یا مارچ 1950 تک وہاں رہے۔ اسی عرصے میں کراچی سے عسکری کو ''ماہِ نو'' کی ادارت کے فرائض سنبھالنے کی پیش کش آئی جو انہوں نے قبول کر لی۔ مدیر کی حیثیت سے انہوں نے ''ماہِ نو'' کا پہلا شمارہ مارچ 1950 میں شائع کیا اور آخری جولائی 1950 میں۔ ''ماہِ نو'' کی ادارت کا یہ ساڑھے پانچ ماہی عرصہ عسکری کو اپنے خاص مزاج کی وجہ سے زیادہ خوش نہ آیا تھا کیونکہ وہ بیرونی دباؤ اور پابندیوں کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس عزیز احمد انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں محکمہ مطبوعات وفلمز کے ڈائریکٹر تھے اور معروف مورخ شیخ ایس ایم اکرام انفارمیشن میں جائنٹ سیکرٹری تھے، اور اس اعتبار سے عسکری کے افسرانِ بالا۔ عسکری کے خطوط بنام آفتاب احمد سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں عزیز احمد صاحب کے رویے اور اپنے محکمے کے کچھ خاص مطالبات سے تکلیف تھی، جو انہیں ترقی پسندوں کے خلاف ایک غنڈے کی طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اگست میں ماہِ نو سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ''ماہِ نو'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انہوں نے جو اداریے لکھے اور دوستوں کے نام اس عرصے میں جو خطوط لکھے ان سے عسکری کے ان منصوبوں کا اظہار ہوتا ہے جو وہ ''ماہِ نو'' میں رہ کر کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ پورے ہوئے کچھ نہ ہوئے۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لکھے ہوئے اداریے اب مقالاتِ عسکری جلد 1 میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

عسکری کے خطوط کے مجموعے

عسکری اردو کے ایک بے انتہا اور انتھک لگن سے لکھنے والے ادیب تھے۔ وہ نہ صرف معیار بلکہ مقدار کے اعتبار سے بھی قابلِ لحاظ لکھنے والے تھے؛ وہ جس تواتر سے لکھتے تھے اسی تواتر سے چھپتے تھے۔ ان کی بہت کم تحریریں ایسی ہوں گی جو فوراً شائع نہ ہو گئی ہوں۔ وہ جس رفتار سے مقالات، مضمون، اداریے، تبصرے، کتابوں کے پیش لفظ اور دیباچے لکھتے یا ترجمے کرتے تھے اسی باقاعدگی سے دوست احباب اور عزیز و اقارب کو خطوط بھی لکھتے تھے۔ وہ نہ صرف خود پابندی سے خطوط کا جواب دیتے تھے بلکہ اسی شدت سے اپنے مکتوب الیہم سے جواب کا تقاضہ بھی کرتے تھے۔ اب جب کہ ان کی کم و بیش تمام تحریریں اور بہت سے خطوط جمع و مدون ہو کر شائع ہو چکے ہیں، ہمارے لیے انہیں تاریخی ترتیب سے دیکھنا آسان ہو گیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق راقم کا خیال ہے کہ کچھ خاص وقفہ ہائے خاموشی کے سوا وہ تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن خط ضرور لکھتے تھے۔ اب تک عسکری کے خطوط کے تین مجموعے سامنے آئے ہیں: خطوط بنام آفتاب احمد، بنام عبادت بریلوی اور مکاتیب عسکری کے عنوان سے وہ مجموعہ جس میں شمس الرحمٰن فاروقی، دیگر ادیبوں اور اعزہ کے نام خطوط ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ملک اور بیرونِ ملک کے رسائل و جرائد (''قومی زبان''؛ ''تخلیقی ادب''؛ ''روایت''؛ ''محراب''، لاہور؛ ''شب خون'' الہ آباد، نیا دور، ''غالب'' کراچی) میں عسکری کے خطوط شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ اب وہ تمام خطوط درجِ بالا مجموعوں میں موجود ہیں اس لیے ہم مختصراً ان مجموعوں کا ذکر کریں گے۔

محمد حسن عسکری --ایک مطالعہ (ذاتی خطوط کی روشنی میں)

اس مجموعے کی حیثیت نہ محض عسکری کے خطوط کی ہے اور نہ ان کی شخصی مطالعے کی، بلکہ یہ دونوں کا آمیزہ ہے۔ لیکن یہاں اس کا ذکر محض خطوط کے حوالے سے ہوگا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد وہ ادیب ہیں جن سے عسکری کی بے تکلفانہ رفاقت سب سے طویل اور گہری تھی اور سب سے طویل مدت کے خطوط بھی انہی کے نام ہیں۔ عسکری کی وفات کے بعد انہوں نے پہلے تخلیقی ادب شمارہ 4 میں عسکری کے چھیاسی

خطوط (بشمول ایک انگریزی خط کے) شائع کرائے تھے۔ اپنے ابتدائیے میں انہوں نے خطوط کے پس منظر کی وضاحت کی تھی مگر ساتھ یہ بھی کیا کہ ان خطوط کے بعض حصوں کو بوجوہ حذف کر دیا گیا ہے۔ 1994 میں ڈاکٹر آفتاب احمد نے ان تمام خطوط کو پانچ انگریزی اور تین اردو خطوط کے اضافے کے ساتھ اپنی درج بالا عنوان کی کتاب میں دوبارہ شائع کیا اور کتاب کے شروع میں اپنے دو مضمون اور آخر میں عسکری کا ایک مضمون اور اس کے جواب میں اپنا ایک مضمون بھی شامل کتاب کیا۔ مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ تخلیقی ادب والے خطوط کے کچھ محذوف حصے تو شامل متن کر دیے مگر دو تین خطوط کے بعض حصے اب بھی محذوف رکھے گئے ہیں۔ اس طرح اس مجموعے میں کل 94 خطوط ہیں، جن میں سے پہلا 6 مئی 1945 کا اور آخری 8 ستمبر 1977 کا ہے۔

ان خطوط میں عسکری نہایت بے تکلفی سے ادبی، ثقافتی، سیاسی مسائل تو زیر بحث لائے ہی ہیں ان میں چند معاصر ادیبوں اور دوستوں کے بارے میں تلخ تمسخرانہ کلمات بھی مجلسی گپ شپ کے انداز سے آ گئے ہیں۔ مگر ان کی سب سے بڑی خوبی، جو دیگر احباب کے نام ان کے خطوط سے ممتاز ہے، وہ یہ ہے کہ ان خطوط میں عسکری کی نجی زندگی اور حتیٰ کہ عشقیہ معاملات کی طرف بھی بڑے تفصیلی اشارے ہیں۔ ان خطوط سے عسکری کی سوانح حیات مرتب کرنے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان میں عسکری کے ذہنی رویے کا ہر رنگ موجود ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ ابتدائی دور میں جہاں عسکری ہر ادبی، غیر ادبی مسئلے پر اپنے قلم کی مہاریں ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں، وہاں بعد کے دور، یعنی مذہب، تصوف اور روایت کی طرف لوٹنے کے عرصے میں وہ اپنے اس بے تکلف مکتوب الیہ سے کوئی خاص ذہنی رفاقت کی امید نہ پا کر نہایت تھمے تھمے محتاط طریقے سے انہیں شریک محفل کرتے ہیں، اور پہلے کی سی بے تکلفی اور ہنسی مذاق بھی بعد کے خطوط میں کم ہوتی گئی ہے۔

خطوط محمد حسن عسکری (بنام عبادت بریلوی)

عسکری کے انتقال کے بعد ان کے کچھ دوستوں کے نام چند خطوط محراب، لاہور 1979 میں چھپے تھے جن میں سات ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام بھی تھے۔ 1993 میں انہوں نے اپنے نام عسکری کے تمام خطوط کو کتابی صورت میں "خطوط محمد حسن عسکری" کے عنوان سے ادارہ ادب و تنقید، لاہور کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں محراب والے خطوط سمیت کل 85 خط ہیں۔ کتاب کے شروع میں ان خطوط کے پس منظر کے حوالے سے ایک "پیش لفظ" اور ایک "مقدمہ" ہے جس میں عبادت صاحب نے دہلی سے لے کر لاہور اور کراچی تک عسکری سے اپنی طویل رفاقت کی کہانی بیان کی ہے۔ ان خطوط کا

دورانیہ 4 مارچ 1950 سے 6 نومبر 1967 تک قریباً 17 برس کا ہے۔ مگر زیادہ تر خط بہت مختصر اور رسمی قسم کے ہیں، جن میں یونیورسٹی کے امتحانات، پرچوں کی تیاری، چیکنگ اور ترسیل کے مسائل ہیں۔ کچھ خطوط جن میں علمی و تکنیکی بحثیں ہیں وہ اس دور کے ہیں جب عسکری تصور روایت کے نقطہ نظر سے لسانیات کے بارے کچھ منصوبے سوچ رہے تھے اور "اورینٹل کالج میگزین" کے لیے خود بھی اور کچھ ملکی و فرانسیسی ادیبوں سے اس موضوع پر مضامین لکھوا رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب احمد کی طرح ڈاکٹر عبادت بریلوی سے بھی عسکری کو روایت کے حوالے سے کسی ذہنی ہم آہنگی کی توقع نظر نہیں آتی۔ اس کا احساس عبادت صاحب کو بھی تھا: "وہ خدا جانے کیوں دینی معاملات کے علمی پہلو پر مجھ سے کبھی بات نہیں کرتے تھے۔" (ص 26) راقم کا خیال ہے کہ اس کا سبب خدا کے علاوہ ہما شما کو بھی معلوم ہے۔ لیکن آفتاب صاحب کے نام خطوط میں عام ملکی، قومی، سیاسی اور ادبی و ثقافتی مسائل پر عسکری جس بے تکان انداز میں باتیں کرتے ہیں عبادت بریلوی کے ساتھ وہ معاملہ بھی نہیں۔ ان خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ ان کی زندگی اور ادبی مشاغل کے جو گوشے ان کے دیگر خطوط میں ان کہے رہ گئے، ان میں سے بعض عبادت بریلوی کے نام والے خطوط میں آ گئے ہیں۔

مکاتیب محمد حسن عسکری (مرتبہ شیما مجید)

یہ عسکری کے ان متفرق خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مارچ 1942 سے لے کر 14 جنوری 1978، اپنی وفات سے چار دن پہلے تک لکھے تھے۔ یہ مجموعہ ان کے طویل ترین دورانیے پر محیط خطوط کا مجموعہ ہے مگر یہ سب کسی ایک شخص کے نام نہیں بلکہ ان کے مکتوب الیہم میں غلام عباس، ممتاز شیریں، صمد شاہین، سلیم احمد، شمیم احمد، ڈاکٹر حمید اللہ، نظیر صدیقی، ایم ایم قریشی، صلاح الدین محمود، مدیر رسالہ الحق، سبط حسن، مظفر علی سید، عبادت بریلوی، سعید محمود، انتظار حسین، شمس الرحمن فاروقی، محمد عمر میمن، سہیل احمد اور محمد حسن مثنیٰ شامل ہیں۔ ان مکاتیب کے عرصہ تحریر اور مکتوب الیہم کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان میں تنوع بہت ہے۔ اس مجموعے کے اکثر خطوط اس سے قبل "محراب"، "شب خون"، "نیا دور"، "روایت"، "غالب" اور "قومی زبان" وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہ خطوط اگرچہ بہت سے لوگوں کے نام ہیں مگر ان کا بڑا اور شاید اہم ترین حصہ شمس الرحمن فاروقی کو لکھے گئے خطوں پر مشتمل ہے۔ 1960 میں عام ادبی مسائل سے تصور روایت کی طرف آنے کے بعد عسکری کی اپنے جن دوستوں سے خط کتابت رہی ان میں فاروقی اس اعتبار سے سب سے منفرد رہے کہ رہنے گئیوں، روایت، تصوف، مابعد الطبیعیات، مذہب اور دین و شریعت کے مسائل پر عسکری نے

صرف انہی سے جی کھول کر گفتگو کی ہے۔ فاروقی کے نام کے یہ خطوط تعداد میں تو صرف 21 ہیں مگر اپنے مشمولات کی وجہ سے نہ صرف اس مجموعے کے بلکہ عسکری کے تمام خطوط میں اہم ترین اور وقت کی راگنی کے مضامین کے ہم پلہ ہیں۔ پہلے پہل یہ خطوط "شب خون" میں چھپے تھے۔ انہی میں کا ایک مضمون نما خط وہ ہے جو شب خون ستمبر 1968ء میں چھپا تھا اور اب مقالاتِ عسکری، ج 1 میں "بے تکلف گفتگو" کے عنوان سے موجود ہے اور عسکری کی ذہنی کایا کلپ کی سب سے موثر داستان بیان کرتا ہے۔ کاش یہ خط / مضمون بھی انہی خطوط میں شامل کیا جاتا!

فاروقی کے نام کے یہ خطوط ایک صفحے سے لے کر پانچ پانچ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض خطوط ادبی تنقید خصوصاً اس تنقیدی طریق کار کے حوالے سے بھی ہیں جسے اردو میں بطور خاص شمس الرحمٰن فاروقی نے فروغ دیا ہے اور جو ہمارے ہاں "ادبی جدیدیت" کے نام سے معروف ہے اور جو امریکی "نئی تنقید" سے متاثر ہے۔ ان خطوط میں عسکری فاروقی کے طرز تنقید کی اہمیت مگر محدودیت کی طرف اشارہ کر کے ان کی تنقیدی ذہانت کو ایک خاص رخ پر موڑتے نظر آتے ہیں۔ ان خطوں میں ڈاکٹر آفتاب احمد والے خطوں کی سی بے تکلفی، شوخ نگاری، خیالی اڑانیں اور معاصر ادیبوں پر بے لاگ تبصرے کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مکاتیب عسکری کے باقی خطوط چونکہ مختلف ادوار کے ہیں اس لیے اُن میں مختلف رجحانات نمایاں ہیں۔ ممتاز شیریں اور صمد شاہین کے نام کے خطوط میں قیام پاکستان کے فوراً بعد کی ادبی و تہذیبی فضا اور اس بارے میں عسکری کے ردعمل کا سراغ ملتا ہے۔ مظفر علی سید اور سہیل احمد خاں کے نام کے خطوط میں زیادہ تر ادبی جدیدیت اور صرف فن پارے تک محدود رہنے والی تنقید کے نقائص کی طرف اشارے ہیں اور محمد عمر میمن کے نام کے خطوط میں ترجمہ تفسیر قرآن کے حوالے سے بھی بحثیں ہیں۔ غرض اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے یہ مجموعہ بھی عسکری کی نیرنگی خیال کا ہر رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔

یہ تمام مجموعہ ہائے خطوط جہاں عسکری کے ادبی و تنقیدی سفر کو تاریخی ترتیب سے دیکھنے میں معاونت کرتے ہیں وہاں ان کے شخصی مزاج اور افتادِ طبع کو سمجھنے کا بھی وافر سامان ہیں۔ عسکری کی سب سے زیادہ بے تکلفی خطوط بنام آفتاب میں نظر آتی ہے۔ مگر بایں ہمہ شوخی و بے تکلفی وہ انہیں ہمیشہ "آپ" سے مخاطب کرتے ہیں۔ یہ شرف تو صرف انتظار حسین کو حاصل ہے کہ ان کے نام اگرچہ چند خطوط ہی ہیں مگر ان میں انہیں وہ "تو"، "یار"، "ابے" جیسے دوستانہ الفاظ سے پکارتے ہیں۔ انتظار صاحب کے پاس تو عسکری کے کچھ خطوط ابھی ایسے بھی ہیں جو اپنے چند شوخیانہ اور ناگفتہ بہ کلمات کی وجہ سے شاید کبھی شائع نہ ہو سکیں۔

ان تمام مجموعوں کے چھپ جانے کے باوجود اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عسکری کے تمام خطوط منظر

عام پر آ چکے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل ایک زمانے میں عسکری اور احمد ندیم قاسمی کے مابین بڑے زوروں کی خط و کتابت رہی ہے۔ جس کی خبر/اطلاع ڈاکٹر آفتاب احمد کے نام 12 جون 1945ء کے ایک خط میں ہے اور جس کی تصدیق قاسمی نے ادبی مکالمے از الطاف احمد قریشی میں شامل اپنے انٹرویو اور جنوری 1978ء میں عسکری کی وفات پر پی ٹی وی کے ایک تعزیتی پروگرام میں بھی کی تھی۔ مظفر علی سید تو اس حوالے سے بہت عرصے تک قاسمی صاحب کے پیچھے بھی لگے رہے کہ ان خطوط کو شائع ہونا چاہیے مگر نہ جانے کس مصلحت کے تحت قاسمی نہ مانے اور آخر میں تو یہ کہہ کر بالکل قصہ ختم کر دیا کہ ''وہ خطوط دیمک کھا گئی ہے''۔ اب جب کہ قاسمی صاحب بھی اللہ کے حضور پہنچ چکے، ممکن ہے کہ ان کے کاغذات کا کوئی وارث عسکری اور قاسمی کے مابین ہونے والی ''بلیغ خط و کتابت'' کا وہ حصہ ڈھونڈ نکالے جو کسی طرح دیمک سے محفوظ رہ گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اغلب گمان ہے کہ عسکری کے اب تک کے خطوط کی اشاعت سے جس شدت کے مباحث پیدا ہوئے تھے اس سے کہیں زیادہ ہنگامہ خیزی اس ''بلیغ خط و کتابت'' کی اشاعت پر ہوگی۔

عسکری کے افسانوں، تنقید، ترجموں، نظر ثانی، انتخاب، خطوط اور مدیرانہ سرگرمیوں کے اس جائزے میں اتنی تفصیل اس لیے ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس کے ذریعے عسکری کی شخصیت اور تخلیقی و تنقیدی فعالیت کے وہ گوشے مزید سامنے لائے جائیں جن کا بیان سابقہ ابواب میں تشنہ رہ گیا تھا۔ عسکری کی کچھ انگریزی تحریریں اور آخری زمانے کے کچھ منصوبے ابھی مزید ایسے ہیں جو یا تو سامنے نہیں آ سکے یا ابھی شائع نہیں ہو سکے۔ ان کا بیان ہم سر دست چھوڑے دیتے ہیں۔

عسکری کے فکر و فن پر مبنی کام کی تفصیل

اس باب میں ہمارا مقصد عسکری پر لکھی گئی کتابوں کا جائزہ لینا ہے۔ ''کتابوں'' کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ ان کے بارے لکھی گئی تحریروں کی تعداد اور مقدار اتنی زیادہ ہے کہ ان کا ذکر تو ایک مستقل مقالے کا موضوع ہے۔ عسکری کے فکر و فن اور شخصی میلانات پر لکھے جانے کا آغاز تو ان کے ادبی کیریئر کے بالکل شروع ہی میں ہو گیا تھا اور آج اپنی وفات کے ربع صدی بعد بھی وہ اسی طرح زیر بحث ہیں جس طرح اپنی زندگی میں۔ ہمارا خیال ہے کہ سرسید اور حالی کے بعد محمد حسن عسکری اردو تنقید کے شاید واحد آدمی ہیں جن کی حمایت اور مخالفت میں لکھی گئی تحریروں کا وزن خود ان کی اپنی تحریروں سے زیادہ ہی نکلے گا۔ لہٰذا ہم نے خود کو صرف ان کتابوں تک محدود کرنا مناسب جانا ہے جن میں ان کی شخصیت اور کام کو سمجھنے کی کسی حد تک ایک مربوط کوشش نظر آتی ہے۔

محمد حسن عسکری -- انسان یا آدمی؟

یہ کتاب عسکری کی وفات کے بعد ان پر لکھی جانے والی پہلی اور ایک اعتبار سے اب تک کی سب سے اہم کتاب بھی ہے۔ اس کے مصنف سلیم احمد ہیں، جن کے بارے میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عسکری کی سوچ، فکر، خیال، طریق فہم، طرز استدلال، ادبی حسیت، محسوساتی طریق کار اور مذہبی و مابعد الطبیعیاتی منہاج سے کامل ہم آہنگی رکھنے کے اعتبار سے اردو کا کوئی دوسرا ادیب ان کا ثانی نہیں تھا۔ سوائے ایک آدھ پہلو کے عسکری کی ادبی، ثقافتی اور مذہبی منہاج و فکر کو اپنی ذات میں جذب کر کے سلیم احمد جس طرح اسے اپنے تخلیقی و تنقیدی اظہار میں بروئے کار لائے تھے وہ محض رسمی استادی شاگردی اور بے روح پیری مریدی کا معاملہ نہیں تھا کہ جہاں مرشد کی کسی بات سے اختلاف ارتداد شمار ہوتا ہے بلکہ سلیم احمد تو عسکری کے ایسے مقلد تھے جن کی حیثیت ''مجتہد فی المذہب'' کی تھی۔

ان کے مزاج اور افتادِ طبع کے بعض گوشے عسکری سے ایسے الگ تھے کہ استاد کے برعکس انہیں ساری زندگی اپنی تردید نہیں کرنی پڑی۔ ان کی طبعی ذہانت اور جودت طبع سے پیدا ہونے والے سوالات اتنے

گنبھیر تھے جو عسکری جیسے علم ایجاد کے لیے بھی چیلنج بن جاتے تھے۔

سلیم احمد کو عسکری سے جتنی عقیدت تھی اور جس طرح وہ اسکا اظہار کرتے تھے اسے دیکھ کر ایک پجاری کا عجز و نیاز دھیان میں آتا ہے۔ وہ خود کو اس صنم کا پجاری اور اس مصور کی تصویر کہتے تھے۔ عسکری کی موت سلیم احمد کے لیے جو ہولناک سانحہ بن کر آئی تھی اس نے انہیں چند دنوں کے لیے تو بالکل گنگ کر دیا تھا۔ پی ٹی وی کے ایک تعزیتی پروگرام میں انہوں نے روتے ہوئے کہا تھا کہ

> "۔۔۔۔لیکن رفتہ رفتہ میری ذاتی زندگی میں یہ ہوا کہ اردو ادب میرے لیے
> صرف محمد حسن عسکری کا نام ہو گیا۔ عسکری صاحب سے میں نے ایک بات سنی
> تھی کہ دنیا بھر میں ادب مر رہا ہے۔۔۔۔اب جو عسکری صاحب گئے۔۔۔۔۔
> عسکری صاحب گئے تو میرے لیے اردو ادب اور سب کچھ مر چکا ہے۔"

اور پھر گیان کی سمادھی میں گم ہو کر کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے چھوٹے چھوٹے گیارہ ابواب پر مشتمل وہ کتاب لکھی جس کا عنوان ہے: *محمد حسن عسکری۔ انسان یا آدمی؟* یہ کتاب جہاں عسکری کے ذہنی سفر اور ان کی شخصیت کے مرکزی مسئلے کی ایک جامع تصویر ہے وہاں ایجاز و اختصار کا بھی شاہکار ہے۔

سلیم احمد عسکری کا مرکزی مسئلہ "انسان" اور "آدمی" کا وہ فرق قرار دیتے ہیں جس کی وضاحت عسکری کے دو اہم ترین مضامین میں ہوتی ہے۔ یعنی "آدمی" تو وہ جوہر ہے جسے اس کی حیاتیاتی و جبلی ضرورتیں۔۔۔بھوک، تناسل، نیند، موت۔۔۔تشکیل دیتی ہیں جبکہ "انسان" ایک مطلق و مجرد تصور ہے جو مغربی فکر کے منطقی نتیجے میں ہمارے زمانے میں روسو کے "تصور انسان" کے زیر اثر خود اپنا خدا بن چکا ہے۔ سلیم احمد انسان اور آدمی کے بارے میں عسکری کے ان تصورات کے اندر موجود کچھ باطنی الجھنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "انسان" کو تہذیبی آدرشوں کا پروردہ ایک خاص وجود کہتے ہیں اور "آدمی" کو جوہری و حیاتیاتی مجبوریوں میں پھنسا ہوا بندگی بے چارگی کا حامل ایک عام وجود۔ اس تناظر میں وہ کہتے ہیں کہ عسکری ایک "خاص آدمی" یعنی تہذیبی و اخلاقی انسان تھے اور "عام آدمی" بننا چاہتے تھے۔ ان کے اندر کا تہذیبی انسان اتنا ترقی یافتہ تھا کہ اس کے مقابلے میں ان کے اندر کا جوہری و جبلی "آدمی" پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اس "انسان" کو ہٹا کر "آدمی" کو آگے لانا چاہتے تھے۔ انسان اور آدمی کی یہی جنگ ان کا مرکزی مسئلہ تھی۔ سلیم احمد نے اس مختصری کتاب میں کمال یہ دکھایا ہے کہ اپنا تھیس عسکری کے تمام اہم مضامین کے تجزیے کی روشنی میں متعین کیا ہے اور ان کے تصور روایت کو بھی انہی مقدمات کا لازمہ بتایا ہے۔ انہوں نے اس امر کی بھی توجیہ کی ہے کہ شریعت اور طریقت کے "جھگڑے" میں عسکری کا جھکاؤ شریعت کی طرف کیوں تھا: وہ خاص آدمی تھے لہٰذا طریقت پسند تھے مگر عام آدمی بننا چاہتے تھے اس لیے شریعت کو ترجیح دیتے تھے۔

عسکری کی شخصیت، نہاد، مزاج، افتادِ طبع اور ان کی ادبی، تہذیبی، مذہبی و مابعد الطبیعیاتی فکر کی تفہیم کے لیے یہ ایک اتنی بنیادی کتاب ہے کہ اسے نظر انداز کر کے عسکری پر کوئی با معنی کام نہیں کیا جا سکتا۔

مشرق کی بازیافت -- محمد حسن عسکری کے حوالے سے

1982 میں عسکری پر آنے والی یہ دوسری کتاب ہے۔ یہ دراصل عسکری پر لکھے جانے والے چند متفرق مضامین کا انتخاب ہے جسے ہندوستانی نقاد ابوالکلام قاسمی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں عسکری کی اپنی تحریروں کا بھی ایک انتخاب دیا گیا ہے جو اب زیادہ تر وقت کی رائج میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں "نئے افسانے کے مسائل" کے عنوان سے جزیرے کا "اختتامیہ" اور افسانہ "حرام جادی" بھی شامل کتاب ہے۔ اپنے "مقدمے" میں مرتب نے اس انتخاب کی غرض و غایت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے "عسکری کے شخصی تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی مرتبے کے تعین" کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ عسکری کی ادبی حیثیت کے تعین کے بہت سے پہلو ہونے کے باوجود انہیں صرف مشرقی اقدار سے وابستہ کر کے دیکھنے کا جواز ابوالکلام قاسمی نے یہ بتایا ہے کہ ان کے "زیادہ تر مضامین کو سامنے رکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ادبی و تہذیبی اقدار کے مطالعے میں ان کے یہاں مختلف تہذیبوں کے تناظر میں "مشرقیت" کی تلاش کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے"۔ کتاب میں اسی نکتے کو مرتب نے اپنے مقدمے "محمد حسن عسکری کی مشرقیت" میں بہ دلائل واضح کیا ہے۔

ابوالکلام قاسمی کے تفصیلی مقدمے اور عسکری کے ایک انتخاب کے علاوہ زیر نظر یہ مضامین شامل ہیں: "تاثرات" کے ذیل میں "عسکری صاحب" از انتظار حسین، "محمد حسن عسکری" از جیلانی کامران، "محمد حسن عسکری ایک یاد" از صلاح الدین محمود۔ یہ مضامین عسکری کا شخصی تعارف پیش کرتے ہیں۔ "قدر و قیمت" کے عنوان کے تحت یہ مضمون رکھے گئے ہیں: "محمد حسن عسکری -- تنقید ایک پہلو" از ابن فرید، "کچھ عسکری صاحب کے بارے میں" از شمیم حنفی، "محمد حسن عسکری اور مرکزی روایت کا تصور" از سید وقار حسین، "محمد حسن عسکری کی تنقید کا نفسیاتی لب و لہجہ" از سلیم اختر، "محمد حسن عسکری -- دینی روایت کا مفکر" از سراج منیر، "محمد حسن عسکری اور ایک بڑی کہانی" از انوار احمد، "عسکری کے خطوط پر نوٹ" از حسن مثنیٰ انور۔ ان مضامین میں عسکری کے تنقیدی و فکری جہت کے چند گوشے خوب نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل عسکری کے مضامین اور ان پر تنقیدی تحریروں کا یہ انتخاب ہندوستان میں عسکری کے تعین قدر کی ایک عمدہ کوشش تھی۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کی اس کتاب کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ یہ اصلاً تو عسکری کے 94 خطوط کا مجموعہ ہے مگر اسکی اضافی خصوصیت ڈاکٹر آفتاب احمد کا لکھا ہوا عسکری کا خاکہ ''محمد حسن عسکری: شخص اور دوست''، ''محمد حسن عسکری اور خواجہ منظور حسین'' اور ''ادب کی موت'' نامی دو مضامین ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا آفتاب احمد وہ آدمی تھے جنہیں عسکری کی دوستی اور قرب کا ایسا امتیاز حاصل تھا جو ان کے دیگر دوستوں کے حصے میں کم ہی آیا تھا۔ عسکری کی رفاقت میں بتائے ہوئے 35 برس کے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں انہوں نے عسکری کا جو بے مثال خاکہ لکھا ہے وہ عسکری کی زندگی، شخصیت، عادات، مزاج اور اہم رجحانات کو سمجھنے میں ان کے خطوط کے بعد سب سے اہم ماخذ ہے۔ ان کی عادات و اطوار اور شخصی زندگی کے پردوں میں گم بعض گوشوں کو اس خاکے کی عدم موجودگی میں سمجھنا محال ہے۔ عسکری کے بعض متضاد رجحانات اور بوالعجب پہلوؤں کو جس طرح اس خاکے میں سمیٹا گیا ہے وہ نہ صرف عسکری بلکہ ان کے دور کی کچھ اور شخصیات، معاملات و واقعات اور ان کے بارے میں عسکری کے ردعمل کو سمجھنے کا وسیع تناظر مہیا کرتا ہے۔ اسلامیہ کالج کراچی میں جانے کے بعد عسکری کی زندگی میں جو ایک چپک مہک پیدا ہوگئی تھی اور وہ جس طرح اپنے شاگردوں میں مگن ہو کر بے خود ہوتے جارہے تھے اس سے جو میگوئیوں اور سرگرمیوں کا بازار اسی زمانے میں گرم ہو گیا تھا۔ ان کے دوستوں کی نجی گفتگو میں اس تبدیلی حال کے محرکات پر باتیں بھی ہونے لگی تھیں مگر ان اسباب پر تفصیلی اور مستند گفتگو پہلی مرتبہ ڈاکٹر آفتاب نے اپنی محرمانہ حیثیت میں کی ہے اور اس سلیقے سے کہ کہنے کی ساری بات کہہ دی مگر کسی کا نام بھی نہیں آیا۔ یہ امر معلوم ہے کہ عسکری کی زود حسی بعض دفعہ زود رنجی کا روپ بھی اختیار کر لیتی تھی۔ شاہد احمد دہلوی اور خواجہ منظور حسین کی طرف ایک زمانے میں ان کا رویہ تلخ ہو گیا تھا۔ آفتاب صاحب نے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں عسکری اور خواجہ منظور حسین کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں شامل ان کا مضمون ''ادب کی موت'' عسکری کے تصور مرگ ادب کا جواب بھی ہے اور وسیع ادبی پس منظر میں اسکی تائید بھی۔ ان امور کی بنا پر یہ کتاب خطوط عسکری کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر بہت کچھ اضافہ بھی ہے۔

پروفیسر محمد حسن عسکری۔۔ایک جائزہ

یہ کتاب معنوی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ اسکے مصنف پروفیسر ایس۔ جی۔ عباس کے

بارے میں ہے اور دوسرا محمد حسن عسکری سے متعلق۔ دوسرا حصہ معناً پھر دو حصوں میں منقسم ہے: ایک میں عسکری کی شخصی زندگی ہے اور دوسرے میں ان کے ادبی و تنقیدی سرمایہ پر تنقید و تبصرہ ہے۔

اس کتاب کی وجہ تصنیف مصنف کا اسلامیہ کالج کراچی میں تبادلہ اور وہاں عسکری کی یاد میں زیرِ ترتیب ایک "عسکری نمبر" کے ادارتی بورڈ میں ان کی شمولیت کے بعد لکھا جانے والا ایک مضمون ہے جو رفتہ رفتہ کتابی صورت اختیار کر گیا تھا۔ پروفیسر ایس۔ جی۔ عباس کو الہ آباد کی اسی یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں تحصیل تعلیم کا موقع ملا تھا جو عسکری کی بھی مادر علمی ہے۔ ان کے استاد بھی وہی تھے جو عسکری کے استاد تھے۔ یہ امر معلوم ہے کہ عسکری اپنے تمام اساتذہ میں پروفیسر ستیش چندر دیب کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت سے کرتے تھے اور اپنے پہلے افسانوی مجموعے جزیرے کا انتساب بھی انہی کے نام کیا تھا۔ معروف نقاد شمس الرحمن فاروقی بھی انہی دیب صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ عسکری اور فاروقی کے مابین جو رشتہ محبت تھا اسکا ایک سبب الہ آباد یونیورسٹی اور دیب صاحب سے ان دونوں کا تعلق بھی تھا۔ مگر عجیب بات ہے ان دونوں کے ہاں اپنے استاد کا ذکر کئی جگہ آنے کے باوجود ان پر تفصیلی کلام نہیں ملتا۔ اس کمی کو کسی حد تک زیر جائزہ کتاب پورا کرتی نظر آتی ہے۔ مصنف نے جب الہ آباد سے پاکستان کے لیے ہجرت کی تو دیب صاحب نے انہیں اپنے مایہ ناز شاگرد محمد حسن عسکری کے لیے ایک تعارفی رقعہ دیا تھا جو ان دنوں اسلامیہ کالج کراچی میں استاد تھے۔ اس وجہ تقریب سے مصنف اسلامیہ کالج میں پہلی مرتبہ عسکری سے ملے اور دوسری ملاقات میں اس لیے بہت عرصہ لگا دیا کہ "پچھلی بار جب میں ان (عسکری) سے ملا تھا تو ان کا رویہ خاطر خواہ نہ تھا" اور وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہ بڑھے تھے۔ بعد میں عباس صاحب کی عسکری سے خاصی ملاقاتیں رہیں، لیکن کتاب کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اور عسکری کے مابین زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی، شاید اسی لیے مصنف کی دلچسپی اور ملاقاتیں اسلامیہ کالج اور وہاں کے دیگر اساتذہ سے زیادہ رہیں۔

عسکری کی دہلی، میرٹھ اور لاہور کی زندگی کے بارے میں ان کے دوستوں کی تحریروں میں خاصا مسالہ مل جاتا ہے مگر کراچی جا کر ان کی بیرونی اور خارجی سرگرمیاں چونکہ محدود تر ہو گئیں تھیں، اس لیے اس حوالے سے لکھی جانے والی تحریریں کم ملتی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسلامیہ کالج کراچی اور اس میں عسکری کی زندگی کے چند گوشوں پر خوب روشنی ڈالتی ہے۔ عسکری کے مزاج اور عادات و اطوار کے بہت سے پہلوؤں کی تو اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے مگر اس میں چند باتیں ایسی بھی ہیں جن کی تائید عسکری کے پرانے مزاج شناس کم ہی کریں گے۔ کتاب کے ایک باب میں مصنف نے عسکری اور سلیم احمد کے تعلق، خصوصاً 70ء کی "جنوبی جماعت اسلامی آویزش" کے پس منظر پر بھی کلام کیا ہے جہاں عسکری کسی استدلالی خطیب کی طرح دھواں دھار تقریر کرتے نظر آتے ہیں جو ہماری معلومات اور مطالعے کے

مطابق عسکری کا اسلوب گفتگو نہیں تھا۔

لیکن یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ یہ امر معروف ہے کہ عسکری آخری دور میں بہت مذہبی ہو گئے تھے اور ان کی نشست و برخاست، حلیے اور پہناوے تک میں اسکے اثرات آ گئے تھے۔ لیکن ان کے عمر بھر کے ساتھیوں اور عزیز و اقارب میں سے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے کبھی داڑھی بھی رکھی تھی۔ لیکن پروفیسر ایس۔ جی۔ عباس کا کہنا ہے کہ ایک روز جب وہ عسکری سے ملنے ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو "دیکھا کہ ایک ذات شریف اپنے چہرہ اقدس پر ریش مبارک جمائے ہوئے، شیروانی میں ملبوس عسکری صاحب کی کرسی پر براجمان ہے۔" شک دور کرنے کے لیے انہوں نے "غور سے دیکھا تو وہی صاحب محمد حسن عسکری نکلے"۔ (86) اس بحث طلب بات کے سوا یہ کتاب اسلامیہ کالج کراچی میں عسکری کے بعض معمولات پر ایک آنکھوں دیکھی دستاویز ہے۔

لیکن جہاں تک عسکری کے فکر و فن پر مصنف کے تنقیدی جائزے کا تعلق ہے ہمارے نزدیک وہ کتاب کا کمزور ترین حصہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ مصنف نے عسکری کے ادبی و فکری تصورات کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں عسکری کے بعض عام تصورات کی تفہیم بھی درست نہیں۔ مثلاً "انسان اور آدمی" کے بارے میں عسکری کے خیالات قدرے مشکل اور عمومی تصورات سے کچھ مختلف ضرور ہیں۔ اور ان میں کچھ الجھاوے بھی ہیں مگر ایسا نہیں ہے کہ ان سے کوئی مربوط نقطۂ نظر اخذ نہ ہو سکے۔ ایس۔ جی۔ عباس کو ان کے تصورات میں نہ عسکری کی تصانیف پڑھنے سے پہلے اور نہ بعد میں کچھ نظر آیا (ص 55,89) اور نہ سلیم احمد کی کتاب پڑھنے سے انہیں کچھ سلجھاؤ ہوا۔ وہ اپنے تئیں میر، غالب اور نظیر اکبر آبادی کے ایسے اشعار کا ڈھیر لگائے جاتے ہیں جن کی موجودگی میں بھی عسکری کو انسان اور آدمی کے بارے میں صحیح تصور نہ مل سکا تھا۔ (باب "انسان اور آدمی") عسکری کے افسانے مصنف کے نزدیک اس لیے معیاری نہیں کہ انہوں نے جنس کے گندے اور رکیک موضوع کو اختیار کر کے گندگی کے ڈھیر میں اضافہ کیا ہے، حالانکہ ان جیسے لائق فائق آدمی کے سامنے دوسرے ہزاروں لاکھوں، ارفع اعلیٰ موضوعات بھی تھے۔ عسکری کا اسلوب تحریر جو ان کے سخت ترین ناقدین کے نزدیک بھی شگفتگی، وضاحت اور توضیحی نثر کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے، پروفیسر عباس اسے "پیچ دار اور غیر بدیہی اسلوب" کہتے ہیں جس کی وجہ سے عسکری کی تحریروں میں مخلتف قسم کی الجھن، بلا کی پراگندگی اور انتشار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ ہمیشہ پن کے ساتھ ذہن میں ایک خاص قسم کا کنفیوژن پیدا کرتی ہیں۔ باقی رہی روایت اور جدیدیت والی بحث تو اس میں بھی پروفیسر عباس صاحب انہی نتائج تک پہنچتے ہیں جو محمد علی صدیقی اور دبستان فنون سے وابستہ دیگر اہل دانش کے نزدیک سراسر گمراہی ہیں۔

مصنف نے اس کتاب کو عسکری پر لکھی جانیوالی تحریروں سے اس حد تک مزین کیا ہے کہ نہ صرف

کتاب کا بڑا حصہ ان کے اقتباسات پر مشتمل ہے بلکہ نتائج بھی بڑی حد تک وہی ہیں۔ عسکری کی شخصیت اور ابتدائی خدوخال کو بیان کرتے ہوئے تو مختار زمن کا عسکری پر معروف خاکہ "17 بیلی روڈ" (مشمولہ تخلیقی ادب 3) تو کم و بیش سارا ہی 150 صفحے کی کتاب میں "جذب" کر دیا گیا ہے۔ مصنف کے ان خیالات کی بدولت یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ ان سے ابتدائے ملاقات ہی میں عسکری کیوں صرف "ہوں ہاں" سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ ہم نے عسکری پر اپنے عرصہ تحقیق کے دوران ان کے کم و بیش تمام پڑھنے والوں سے زیر جائزہ کتاب کے بارے میں رائے طلب کی مگر معلوم نہیں کیوں ان میں سے ایک دو کے علاوہ کوئی بھی اس کتاب اور اسکے مصنف سے آشنا نہ تھا۔ البتہ اس کتاب پر معروف نقاد محمد علی صدیقی کا جو مقدمہ ہے، اس میں قابل فہم طور پر کتاب کی معنویت اور مصنف کی محنت کی داد دی گئی ہے۔

محمد حسن عسکری ، ایک عہد آفریں نقاد

یہ کتاب عسکری پر لکھے جانیوالے بیس متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جسے اشتیاق احمد نے مرتب کیا ہے اور یہ 2005ء میں آئی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین چونکہ مختلف موقعوں پر اپنے اپنے انداز میں لکھے گئے ہیں اسلیے ان میں کسی خاص نقطہ نظر، عسکری کے کسی خاص پہلو کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور نہ ہی مرتب نے انہیں کسی خاص زاویے سے ترتیب دیا ہے۔ مرتب کا منشا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عسکری پر لکھی ہوئی مختلف نقادوں کی تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تا کہ ان کے بارے مختلف قسم کی آراء اکٹھی ہو جائیں اور پڑھنے والا خود کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا عسکری کی ادبی و فکری تصورات کے مختلف پہلوؤں پر حمایت اور مخالفت کے انداز میں اتنا کچھ لکھا جا چکا کہ ان کے سرسری جائزے کے لیے بھی ایک کتاب کی وسعت درکار ہے۔ اب جبکہ عسکری کا کم و بیش تمام تحریری سرمایہ مرتب و مدون ہو چکا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے بارے میں لکھی گئی تحریروں کو بھی کسی تخمیم یا نوعیت کے لحاظ سے مختلف مجموعوں میں جمع کیا جائے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے زیر جائزہ کتاب کے مرتب اشتیاق احمد کے پیش نظر ایک ایسا ہی منصوبہ اور بھی ہے۔ اگر یہ کام ہو سکے تو یہ عسکری کی تعیین قدر کے لیے ایک بہترین کاوش ہوگی۔

عسکری کی ادبی سرگرمیوں کے بہت سے پہلو ہیں: مثلاً افسانہ نگاری، نثر نگاری، تراجم اور تنقید۔ پھر ان کی تنقید کے بھی کئی گوشے ہیں۔ ان کے ابتدائی ترقی پسندی، جدیدیت، تہذیب و کلچر، تحریک پاکستان اور مسلم شعور کے مسائل، پیروی مغرب کی حمایت و مخالفت، رومانوی اور نفسیاتی تنقید، روایت اور جدیدیت کی کشمکش، مشرقی و مغربی طرز احساس کا فرق، اردو اور مغربی زبانوں کے اسالیب اظہار کا

مسئلہ، عسکری کی شخصیت، مزاج اور اسلوب وغیرہ۔ضرورت ہے کہ ایسے بہت سے پہلوؤں پر لکھی گئی حامیانہ،مخالفانہ،دونوں قسم کی تحریروں کو جلی یا خفی عنوانات کے تحت ترتیب دیا جائے۔اور اپنے اصول یا معیار ترتیب کی مدلل وضاحت مقدمے میں کی جائے۔ان اصولوں پر مدون کیے ہوئے مجموعے کی اہمیت بالحاظ معیار ترتیب دیے ہوئے مجموعے سے بہر حال زیادہ ہوگی۔

لیکن زیر جائزہ مجموعے سے کم از کم ایک بات تو واضح ہوتی ہے۔وہ یہ کہ ہماری ادبی وتنقیدی دنیا میں عسکری کی اہمیت ان کے انتقال کے ربع صدی بعد بھی کم نہیں ہوئی۔ان کے اپنے معاصرین کی طرح عسکری پڑھنے لکھنے سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والی آج کی نوجوان نسل کے لیے بھی کشش و گریز کا سامان ہیں۔اشتیاق احمد نے جو گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج قصور کے ایک نوجوان استاد ہیں، یہ کتاب مرتب کر کے اسی امر کا ثبوت دیا ہے۔

عسکری کے بارے میں چند رسائل وجرائد کے خصوصی گوشے

عسکری کا انتقال جنوری 1978 میں ہوا تھا۔پاکستان سے ہندوستان تک اور دنیا میں جہاں جہاں بھی ان کے پڑھنے والے تھے وہاں اس افسوسناک سانحے کی خبر نے سب کو مبہوت کر دیا تھا۔ مدتوں تک اخبارات میں انکی ادبی وتنقیدی اور تعلیمی سرگرمیوں پر کالم چھپتے رہے اور ملک کے ادبی حلقوں میں تعزیتی پروگرام ہوئے۔جنوری 1978 میں پاکستان ٹیلیویژن نے ان پر ایک تعزیتی پروگرام نشر کیا جسمیں ملک کے صف اول کے ادیب، شاعر اور اہل دانش شریک تھے: فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد اجمل، آفتاب احمد، احمد ندیم قاسمی، سلیم احمد، عبادت بریلوی، انتظار حسین، ڈاکٹر جمیل جالبی اور بہت سے دوسرے حضرات نے عسکری کی زندگی اور فکروفن پر تاثر انگیز باتیں کی تھیں۔ پروگرام کے کمپیئر صدیق ارشد نے شروع میں یہ کہہ کر سب کو حیران کر دیا کہ عسکری جس کی ذاتی لائبریری میں دنیا بھر کی کتابیں جمع تھیں، اس میں سے ہمیں اس پروگرام کے لیے ان کی اپنی ایک کتاب بھی نہ مل سکی اور نہ ان کا اپنا کوئی فوٹوگراف ہی ملا، حالانکہ وہ خود ایک ماہر فوٹوگرافر تھے......اس طرح کے تعزیتی پروگرام ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی نشر کیے گئے تھے۔

ماہ نو

عسکری کے انتقال پر ادبی جرائد میں سب سے پہلے جس پرچے نے ان پر ایک خصوصی گوشہ شائع کیا وہ "ماہ نو" تھا۔اس وقت اس کی ایڈیٹر کشور ناہید تھیں۔مارچ 1978ء کی اس خصوصی اشاعت میں کم

وبیش 40 صفحے ''بارے محمد حسن عسکری'' کے عنوان کے تحت عسکری کے لیے وقف کیے گئے تھے جس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، انتظار حسین، جیلانی کامران، شمیم احمد، سلیم اختر، انیس ناگی اور انوار احمد وغیرہ کے مضامین تھے۔ ''ماہِ نو'' سے عسکری کو پرانا تعلق تھا اور وہ اسکے دوسرے ایڈیٹر رہے تھے، علاوہ ازیں ان کے بہت سے اہم ترین مضامین بھی ماہِ نو ہی میں چھپتے رہے تھے۔ ان میں سے چند مضامین کا ایک انتخاب بھی اسی خصوصی شمارے میں شائع کیا گیا تھا۔ لیکن جو شے اس میں بالکل نادر و نایاب تھی وہ عسکری کے بنائے ہوئے آٹھ فوٹوگراف تھے، جن میں سے تین ''خود مصور۔ خود تصویر'' کے مصداق ان کے اپنے فوٹو تھے۔ باقی کے فوٹوؤں میں انتظار حسین اور احمد مشتاق، انتظار حسین، سلیم احمد اور عسکری اور ان کے ایک دوست اور اڑتے ہوئے کبوتروں کا ایک ارضی منظر ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ فوٹو وہ ہے جس میں شیروانی اور پاجامے میں ملبوس سلیم احمد اور سوٹ بوٹ میں ملبوس انتظار حسین اونٹ پر بیٹھے ہوئے سامی اور ہند آریائی تہذیب کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ یہ گویا عسکری کے تخلیقی دماغ کا فنکارانہ اظہار تھا جسمیں انہوں نے اپنی ثقافتی وارضی جڑوں کو تلاش کرنے والے ان دونوں ادیبوں کی ادبی حیثیت کو گویا مجسم کیا ہے۔ ''ماہِ نو'' کا یہ شمارہ اس اعتبار سے ایک عمدہ اور پہلی دستاویز تھی۔

مکالمہ، شمارہ 5

مبین مرزا نے کراچی سے جب کتابی سلسلے ''مکالمہ'' کا اجرا کیا تب سے اس کی ایک خصوصی نسبت عسکری کے بارے میں لکھی جانیوالی تحریروں سے رہی ہے۔ لیکن مدیر موصوف نے اس کے پانچویں شمارے، نومبر 1999ء۔ مئی 2000ء میں دو سو صفحات پر مشتمل (تقریباً نصف حصہ) ''خصوصی گوشہ محمد حسن عسکری'' ان کے شخصی وتنقیدی مطالعے کے لیے مختص کیا ہے۔

''محمد حسن عسکری: ایک مطالعہ'' کے تحت اس حصے میں سب سے پہلے عسکری کی تین نادر اور کمیاب تحریریں ہیں: ''ازمنہ وسطیٰ کا تصور''، ''مخدوش رابطے'' (ترجمہ) اور ''کبھی اے حقیقت منتظر'' (ترجمہ)۔ پہلی تحریر ایک نامکمل سی تحریر ہے جو غالباً عسکری کے دور آخر میں جدیدیت ہی کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ مکالمہ میں اسے ادارے کے ایک حاشیے کے ساتھ چھاپا گیا ہے جس میں اس کے پس منظر کا تعین کیا گیا ہے۔ رینے گینوں کی تحریروں کی روشنی میں عسکری کا خیال تھا کہ مغرب کی سرکاری تاریخ کے زیر اثر ہمارے ہاں بھی یہ رائے ایک مستحکم حقیقت کے طور پر مان لی گئی ہے کہ سلطنت روما کے زوال سے نشاۃ ثانیہ کے آغاز تک یعنی 474 تا 1453ء کا ہزار سالہ دور (جو دراصل مغرب میں عیسائیت کے فروغ کا دور ہے اور جسے مغرب کی تاریخ میں دور وسطیٰ کہا جاتا ہے) فی الاصل دور ظلمت

(Dark ages) ہے۔اس مضمون میں عسکری نے اس تصور کے رائج ہونے اور اسکے پیچھے کارفرما مغرب کے متعصبانہ ذہن کا پس منظر بیان کیا ہے۔

دوسری تحریر شودر لو دلاکلو کے ایک ناول کا ناتمام ترجمہ ہے جو عسکری نے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔اسکی تفصیل ہم سابقہ باب میں "عسکری کا ایک ناتمام ترجمہ" کے حوالے سے دے چکے ہیں۔تیسری تحریر عسکری کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو انہوں نے 1956 میں اسی سال چھپنے والے سیموئیل بیکٹ کے معروف زمانہ کھیل Waiting for Godot پر ایک تبصرے کی صورت میں لکھا اور پاکستان ٹائمز میں چھپوایا تھا۔اس مضمون کا انگریزی سے اردو ترجمہ مظفر علی سید نے کیا اور شروع میں ایک مختصر سے نوٹ میں گوڈو کا انتظار اور عسکری کے اس مضمون کی اہمیت پر روشنی بھی ڈالی ہے۔اس کے مطابق عسکری نے اس کھیل پر یہ بھرپور استقبالی مضمون اس زمانے میں لکھا تھا جب برطانوی یا امریکی دنیا میں بھی اسکا چرچا خال خال ہی تھا اور اسے ایک عجوبے سے زیادہ کی اہمیت نہ دی گئی تھی۔اس پس منظر میں "1956 میں ہمارے ایک لکھنے والے کا اس عہد آفریں ڈرامے کی اہمیت پر اصرار ایک ایسا تنقیدی افتخار ہے جو دنیا میں کم لوگوں کو حاصل ہوا ہوگا"۔سچی بات یہ ہے کہ اردو دنیا میں عسکری کی یہی دلیری اور جیالا پن تھا جس کی بنا پر وہ اپنے معاصر ادب کے بارے میں دوسروں کی آراء کا انتظار کرنے کے بجائے خود اس پر ایک تنقیدی پیش گوئی کے طور پر بات کرنے سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔لفظ "گوڈو" کی جو بہت سی تعبیریں کی گئی ہیں اس بنا پر مظفر صاحب نے اس ترجمے کا عنوان اقبال کے ایک مصرعے سے اخذ کرتے ہوئے "کبھی اے حقیقت منتظر" رکھا ہے۔

ان تین تحریروں کے بعد عسکری کی زندگی اور تنقیدی خیالات پر گیارہ مضمون ہیں جن میں سے ایک اجمل کمال کا "نقادوں کی خدائی (مثنوی کی غلط تعبیر)" کے عنوان سے ہے جس میں عسکری کا استرداد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔اس اعتبار سے مکالمہ 5 کا یہ خصوصی گوشہ عسکری کی صرف مداحی کا ہی نہیں بلکہ ان پر ایک غیر جانبدارانہ پیش کش کا بھی ایک نمونہ ہے۔

The Annual of Urdu Studies ,vol.19,2004

(AUS) *The Annual of Urdu Studies*

یعنی "سالانہ دراسات اردو" University of Wisconsin, Madison کے ایشیائی زبانوں اور ثقافتوں کے شعبے کا انگریزی مجلّہ ہے جسمیں ہر سال اردو زبان وادب کے جدید وقدیم مطالعات پر عالمانہ تحریروں کا ایک ضخیم انگریزی انتخاب شائع ہوتا ہے۔اس کے ایک حصے میں اردو رسم الخط میں اردو کی نئی اور پرانی تحریریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔اسکے موجودہ ایڈیٹر معروف اسکالر نقاد اور

طرحدار مترجم (انگریزی، اردو، انگریزی) محمد عمر میمن ہیں جو آج کل وسکانسن یونیورسٹی کے متعلقہ شعبے میں اردو، فارسی اور اسلامی علوم کے پروفیسر ہیں۔ AUS کے 2004ء میں آنے والے شمارے 19 کا ایک اہم حصہ جو دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، محمد حسن عسکری کے اہم ترین افسانوں اور مضامین کے انگریزی تراجم اور ان پر لکھی گئی تحریروں کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ یوں تو عسکری کے بعض اردو مضامین کے انگریزی ترجمے کا کام قیصر عالم نے کراچی سے شائع ہونے والے اپنے انگریزی میگزین Studies in Tradition, 1992-93 میں بھی شروع کیا تھا مگر AUS کی یہ کوشش اہمیت اور وسعت کے اعتبار سے بہت آگے کی شے ہے۔ یہ سراسر محمد عمر میمن کی عسکری شناسی کا نتیجہ ہے۔ عسکری کے خطوط میں ان کا ذکر فاروقی کے نام والے خطوط میں ہے اور مکاتیب عسکری کے چند خطوط میمن کے نام بھی ہیں، جہاں وہ ان سے قرآن پاک کے انگریزی ترجمے اور تفسیر کے مسائل پر کلام کر رہے ہیں۔ عسکری شناسی پر کام کرنیوالے دیگر جدید نقادوں میں محمد عمر میمن کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ جہاں دوسرے نقاد ''روایت'' سے پہلے والے عسکری کو ہی اہمیت دیتے ہیں وہاں میمن کے نزدیک عسکری کے دونوں ادوار کی مہمات قابلِ توجہ ہیں۔ اس امر کی شہادت AUS کے موجودہ انتخاب میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

AUS کے اس شمارے میں ''اسپیشل فیچر'' کے تحت عسکری کے جن مضامین اور افسانوں کا ترجمہ کیا گیا یا عسکری پر جو مضامین پیش کیے گئے ان کی تفصیل یہ ہے: سب سے پہلے "Towards a Prose of Ideas :An Introduction to the critical thought of Muhammad Hasan Askari" کے عنوان سے مہر افشاں فاروقی کا ایک مضمون ہے اور پھر عسکری کے چند مضامین کے تراجم ہیں۔ ہم صرف عسکری کے ان مضامین کے اردو عنوان دے رہے ہیں: ''ترجمے سے فائدہ اٹھانے والے''؛ ''کچھ اردو نثر کے بارے میں''؛ ''پیروی مغربی کا انجام''، ترجمہ: مہر افشاں فاروقی۔ ''قحط افعال''؛ ''استعارے کا خوف''، ترجمہ: باراں رحمن۔ (87) مہر افشاں فاروقی نے عسکری کا معروف افسانہ ''حرام جادی'' بھی "The Bitch" کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے اور اس افسانے کے متعلق ایک اہم نوٹ بھی لکھا ہے۔ فاروقی گھرانے کی ان دو افراد نے عسکری کے جو تراجم کیے ہیں وہ تمام کے تمام ''ادبی'' عسکری یعنی تصورِ روایت کی طرف چلے جانے والے عسکری سے قبل کے عسکری کے افسانے و مضامین ہیں۔

باقی کے تراجم اور مضامین محمد عمر میمن کی محنت کا نتیجہ ہیں: اس حصے میں عسکری کے تین اہم اور معنی خیز مضامین کا ترجمہ ہے: ''ادب میں صفات کا استعمال''؛ ''ابن عربی اور کیر کے گور'' اور ''مشرق اور مغرب کی آویزش (اردو ادب میں)''۔ پہلے اور دوسرے مضمون کے ترجمے سے قبل مترجم نے ان دونوں

مضامین کی معنویت اور عسکری کے حوالے سے چند بنیادی نکات کی وضاحت کے لیے دو بہت ہی اہم مضمون ''شذرات از مترجم'' کے عنوان سے لکھے ہیں: "Askari's 'Noun and Tasavvuf' " اور "Askari's 'Ibn-e-Arabi and Kierkegaard' "

AUS کے اس ''گوشۂ عسکری'' میں ان انگریزی تراجم کے ذریعے عسکری کے دونوں ادوار کے بعض خیالات سے بیرونی دنیا کو متعارف کروانے کی جو کوشش کی گئی ہے ان کا ایک اہم عنصر مترجمین کے وہ مضامین اور حواشی ہیں جن میں انہوں نے عسکری کی زندگی اور خصوصاً زیرِ ترجمہ مضامین کی اشاعت اور ان میں آنے والے بعض وضاحت طلب امور پر بحث کی ہے۔ ان مضامین کی اہمیت نہ صرف انگریزی بلکہ اردو خواں طبقے کے لیے بھی بہت زیادہ ہے۔

ہم یہاں صرف مہر افشاں فاروقی اور محمد عمر میمن کے ایک ایک خاص نکتے کی طرف اشارہ کر کے یہ جائزہ ختم کرتے ہیں: "Towards a Prose of Ideas" میں افشاں فاروقی نے اردو نثر اور تراجم کے مسائل پر لکھے گئے عسکری کے مضامین کی روشنی میں یہ اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ اردو کے اسالیب بیان کی توسیع کے لیے عسکری نے جہاں جذبے اور خیال کو ایک دوسرے میں سمونے والی اور خیال یا عقلی و فکری عناصر کو باہم آمیخت کرنے والی نثر کے فقدان کا ذکر کیا ہے وہاں خود انہوں نے اپنی نثر میں یہ خوبی پیدا کر کے خود اس طرح کی نثر کا ثبوت بھی مہیا کر دیا ہے۔ اس بنا پر مضمون نگار نے اردو نثر کے تاریخی تناظر میں عسکری کو اردو میں ''خیال کی نثر کا بانی'' قرار دیا ہے۔

محمد عمر میمن نے عسکری کے جو مضامین ترجمے کے لیے انتخاب کیے ہیں، اول تو یہی امر بہت معنی خیز ہے کہ وہ سب کے سب وقت کی راکھ سے اخذ کیے گئے ہیں جو ان کے دورِ روایت والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ میمن نے اپنے توضیحی حواشی اور مضامین میں، خصوصاً ابن عربی اور کیر کے گور کے پس و پیش منظر میں، عسکری کے دورِ آخر کے بعض رجحانات پر مفصل کلام کرتے ہوئے اردو ادیبوں اور دانشوروں کے اس رویے پر تعجب کا اظہار کیا ہے جو عسکری کے پورے مشرق کی طرف سے بولنے کو ''اپنی حد سے تجاوز'' شمار کرتے ہیں۔ (88) اس تناظر میں میمن صاحب نے مشرق بعید کی تہذیبوں کے ان مشترکہ تصورات کا جائزہ لیا ہے جن کی بنا پر عسکری کی یہ جرأتِ رندانہ باجواز ٹھہرتی ہے۔ میمن کے ان مضامین میں کئی ایسے مباحث ہیں جو ان نقادوں کے لیے دعوتِ فکر ہیں جو بعد کے دور کے عسکری سے کسی حد تک توحش رکھتے ہیں۔

مختلف جامعات میں عسکری پر ہونے والا تحقیقی کام

مذکورہ کتب اور رسائل کے گوشوں کے علاوہ عسکری کے فکر وفن پر مختلف جامعات میں بھی ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

	عنوان مقالہ	مقالہ نگار	برائے	نگران	نام یونیورسٹی	سال
1	"محمد حسن عسکری"	سہیل احمد	ایم اے اردو	ڈاکٹر عبادت بریلوی	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج	1968
2	"Muhammad Hasan Askari-The Paragon of Urdu Literature"	محمد سہیل عمر	ایم اے انگریزی	عبدالحمید خان	گورنمنٹ کالج، لاہور، شعبہ انگریزی	1979
3	"محمد حسن عسکری اور تصور روایت"	شیریں صابرہ	ایم اے اردو	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	پنجاب یونیورسٹی	1987
4	"محمد حسن عسکری کی افسانہ نگاری"	بشریٰ رؤف	ایم اے اردو	ڈاکٹر سہیل احمد خاں	پنجاب یونیورسٹی	1979
5	"حسن عسکری بحیثیت تنقید نگار"	رشدہ ملک	ایم اے اردو	ڈاکٹر شفیق احمد	اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور	

نمبر	عنوان	مقالہ نگار	سطح	نگران	جامعہ	سال
6۔	''محمد حسن عسکری کے تنقیدی تصورات اور دیگر قدیم وجدید رویوں کا تقابلی جائزہ''	عبدالعزیز (عزیز ابن الحسن)	پی ایچ ڈی	ڈاکٹر تحسین فراقی	پنجاب یونیورسٹی	2006
7۔	''محمد حسن عسکری اور تہذیبی مباحث''	ناصر حیات	ایم فل	ڈاکٹر نثار احمد قریشی	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۔
8.	''محمد حسن عسکری۔ حیات وخدمات''	ندیم احمد	پی ایچ ڈی	۔	کلکتہ یونیورسٹی (بھارت)	۔

مقالہ نمبر 6، 2006ء میں تعین قدر کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ نمبر 7 اور 8 ابھی تکمیل کے مراحل میں ہیں۔(89)

حواشی

(1) عسکری کے یہ گھریلو اور خاندانی حالات ہم نے ان کے بھائی محمد حسن مثنیٰ کے خط سے لیے ہیں جو انہوں نے مشفق خواجہ کے ایک خط کے جواب میں محمد حسن عسکری کے ابتدائی حالات مہیا کرنے کی غرض سے لکھا تھا۔ خط مکالمہ، کراچی شمارہ ۵، میں چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی نادر معلومات ہمیں مثنیٰ صاحب کے ساتھ نجی نشستوں میں ملی ہیں۔ باقی ماخذ الگ سے مذکور ہیں۔

(2) عسکری کے الہ آباد کے زمانہ قیام اور یونیورسٹی کے ابتدائی ساتھیوں میں سے معروف صحافی مختار زمن نے "۷ ایلجن روڈ" (مشمولہ تخلیقی ادب، شمارہ ۳) کے عنوان سے عسکری کا ایک خاکہ لکھا تھا جس میں الہ آباد میں ان کی آمد، پروفیسر نعیم الرحمن کے ہاں قیام اور اس زمانے کے عسکری کی عادات واطوار اور مزاج کی طرف دلچسپ پیرائے میں اشارے کیے گئے ہیں۔ عسکری کے حالات کے بیان میں ہم نے جا بجا اس سے استفادہ کیا ہے۔

(3) عسکری، محمد حسن، مقالات محمد حسن عسکری، ج ۱؛ آئندہ اس کتاب کا حوالہ 'مقالات عسکری' کے مختصر عنوان سے دیا جائے گا۔

(4) مقالات عسکری، ج ۱، ص419

(5) مقالات عسکری، ج ۱، ص425

(6) عسکری، "بے تکلف گفتگو"، در مقالات عسکری، ج ۱

(7) مقالات عسکری، ج ۱، ص360

(8) مقالات عسکری، ج ۲

(9) دیکھیے مثنیٰ کا خط در مکالمہ ۵؛ اور دیباچہ از جمیل جالبی، مشمولہ عسکری کے افسانے

(10) تقسیم سے قبل عسکری کو روزگار کے جو مسائل درپیش ہوئے اس کا ذکر ان کے خطوط بنام

آفتاب احمد، مشمولہ ''تخلیقی ادب'' 4 میں ہے۔ اس کے لیے 47-1945ء کے چند خطوط دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں آفتاب احمد کے نام کے خطوط کا جو بھی حوالہ ہے وہ تخلیقی ادب شمارہ ۴ سے ہے۔ یہ خطوط اب محمد حسن عسکری۔ ایک مطالعہ از آفتاب احمد میں بھی شامل ہیں۔

(11) عالی، جمیل الدین، بس اک گوشۂ بساط: عبادت بریلوی: ''مقدمہ'' خطوط محمد حسن عسکری

(12) خطوط بنام آفتاب احمد 25 فروری، 8 جولائی، 11 اگست 1947ء: خاکہ غلام عباس از عسکری، در مقالات عسکری، ج ا

(13) بنام آفتاب احمد، 4 فروری 1947ء

(14) مکتوب بنام آفتاب احمد، 8 جولائی 1947ء

(15) مظفر علی سید نے عسکری پر اپنے ایک غیر مطبوعہ خاکے ''ایسے پھر خانماں خراب کہاں'' میں اس زمانے کے عسکری کے گھر کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس خاکے کی صوتی ریکارڈنگ راقم کے پاس محفوظ ہے۔

(16) عسکری کی لاہور کی اس ابتدائی زندگی کے حالات کے لیے دیکھیے انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، کے ابتدائی صفحات

(17) آفتاب احمد: ''نیا دور''، شمارہ 88-87 ص 229,254

(18) مشمولہ مقالات عسکری ج ا اور ۲: انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۳۴

(19) دیکھیے آفتاب احمد، محمد حسن عسکری، ایک مطالعہ ص 38: اور مئی 1946ء کی ''جھلکیاں'' جس میں عسکری خود کو قائد اعظم کا وفادار کہہ کر ان کے اثر سے آزادی کے خواہاں بھی ہیں۔

(20) دیکھیے عسکری: ''جھلکیاں'' مابین ستمبر دسمبر 1948ء

(21) تفصیل کے لیے فتح محمد ملک، سعادت حسن منٹو: ایک نئی تعبیر، باب اول

(22) خط، بنام ممتاز شیریں 20 جولائی 48، مشمولہ مکاتیب عسکری

(23) دیکھیے احمد ندیم قاسمی کا کھلا خط بنام منٹو، مشمولہ میرے ہم سفر

(24) اس قرارداد کی روداد اور احمد ندیم قاسمی کی طرف سے اس کے جواز کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''سویرا''، شمارہ 8 ,7: یاد رہے کہ قاسمی صاحب بعد میں خود کو مسلسل اس سے بری الذمہ قرار دیتے رہے ہیں۔

(25) جھلکیاں، ص356: محولہ بالا خط عسکری بنام ممتاز شیریں: انٹرویو احمد ندیم قاسمی، در ادبی مکالمے۔، ڈاکٹر آفتاب احمد، محمد حسن عسکری، ص929

(26) خط بنام آفتاب احمد، ۱۰ فروری و 25 مئی ۱۹۳۶

(27) تفصیل دیکھیے تخلیقی عمل اور اسلوب، ص299، 179، 115: مقالات عسکری، ج2، ص340، 102: یونس جاوید، حلقہ ارباب ذوق، ص239، 211، 290

(28) خط بنام صمد شاہین 17 مارچ 1949، در مکاتیب عسکری، ص91

(29) تاثیر اور عسکری کی دوستی، وجہ اختلاف اور تاثیر کی زیادتی کی تفصیل کے لیے دیکھیے عسکری: ''جھلکیاں'' دسمبر ۱۹۴۸، ؛ ڈاکٹر آفتاب احمد، محمد حسن عسکری۔ایک مطالعہ

(30) ماہِ نو کے یہ ادارے اب مقالات محمد حسن عسکری، ج اول، میں شامل ہیں۔

(31) Askari, M H, "Sixteen years in the Islamia College",in Islamia College Founders Day Souvenir, Mar., 1966 : عباس، پروفیسر ایس جی، محمد حسن عسکری: ایک جائزہ کا باب پنجم۔ اس کالج کی تاریخ، پس منظر، تعلیمی خدمات اور وہاں عسکری کی سرگرمیوں کے لیے اس کتاب میں وافر مواد ہے

(32) سلیم احمد، مشرق، ص77-70: شمیم احمد، زاویہ نظر، ص270ff

(33) تفصیل کے لیے دیکھیے آفتاب احمد، محمد حسن عسکری، ص 53, 50, 34, 32

(34) ان معاملات کے لیے دیکھیے عسکری کے مضامین: ''موجودہ ادبی جمود اور اس کے کچھ اسباب'' جنوری 1951، مشمولہ مقالات عسکری ج ا؛ ''معاشرہ اور ادیب'' جون 1951، ''تخلیق اور اسلوب'' دسمبر 1951، ''ادب اور قارئین ادب'' جولائی 1953، ''اردو ادب کی موت'' ستمبر 1953، مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب: ''تنقید کا فریضہ'' 1954، مشمولہ ستارہ یا بادبان: ''اردو تنقید کا باب اکبر'' 1954؛ ''ادب کی زندگی اور موت'' 1955، در مقالات عسکری، ج ا

(35) ان مسائل پر عسکری کے خیالات کے لیے دیکھیے ''تھینک یو امریکہ''؛ ''معصومان یورپ اور اسلام''؛ ''بام حرم کا نیا کبوتر''؛ ''الجزائر کا نیا ذہن''؛ ''مقدس جنگ'' اور ''مراکش کا داستان گو'' مشمولہ مقالات عسکری، ج1 اور 2

(36) آفتاب احمد، محمد حسن عسکری، ص۴۰

(37) انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص151

(38) تفصیل کے لیے دیکھیے مکتوب عسکری بنام ممتاز شیریں، 20 جولائی 1948ء ؛ خطوط بنام سبط حسن، مشمولہ مکاتیب عسکری: ''مشترکہ ادبی انجمن کی تجویز'' مشمولہ مقالات عسکری، ج 2

(39) دیکھیے مکتوب بنام آفتاب احمد، 8 جولائی 1947ء، مکتوب بنام شمس الرحمٰن فاروقی، 10 جون 1968ء مشمولہ روایت، اول، ص 91؛ ''بے تکلف گفتگو'' مشمولہ مقالات عسکری، ج ا، ص 42

(40) مقالات عسکری، ج ۲، ص ۱۸۱

(41) دیکھیے ان کے مضامین ''استاد بندو خان'' مشمولہ مقالات عسکری؛ ''وقت کی راگنی'' اور خطوط بنام سہیل احمد، مشمولہ مکاتیب عسکری

(42) دیکھیے ''انسان اور آدمی'' ، اور مقالات عسکری ج 2 میں فنون لطیفہ اور چینی موسیقی کے رموز پر ان کے مضامین

(43) سجاد باقر رضوی ''عسکری صاحب'' مشمولہ محراب 1979ء؛ عسکری کی کلاس کے ماحول اور ان کے طریقہ تدریس کے بارے میں دوسروں اور خود ان کی اپنی رائے کے لیے دیکھیے عسکری: ''عبرت نامہ معلم'' مشمولہ مقالات عسکری، ج ۲؛ نسیم ہمدانی، ''عسکری صاحب کی کلاس'' مشمولہ ''سیارہ'' کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء؛ ضمیر علی بدایونی؛ ''محمد حسن عسکری'' ایک تاثر ایک سوال'' مشمولہ مکالمہ 5

(44) عمیم اختر: ''محمد حسن عسکری'' مشمولہ تخلیقی ادب 3

(45) مکتوب بنام محمد حسن مثنیٰ 21 اپریل 1965ء مشمولہ مکاتیب عسکری

(46) دیکھیے ان کا خاکہ از عمیم اختر

(47) انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص 52

(48) بنام محمد ارکون، اصل خط مطبوعہ پاکستان ٹائمز 26 جنوری 1979ء، اس کا اردو ترجمہ از مظفر علی سید، مشمولہ مقالات عسکری۔ معروف نقاد شہزاد منظر نے مجملہ اور باتوں کے عسکری کی فرانسیسی دانی کو بھی ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

(49) عسکری بنام فاروقی 3 رمضان 1388ھ، مشمولہ روایت اول، ص 92

(50) تفصیلات کے لیے دیکھیے فرخی، ڈاکٹر اسلم، محمد حسین آزاد: حیات و تصنیفات دو جلد؛ صادق، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد: احوال و آثار کے ابتدائی ابواب

(51) منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ص 306 و بعد

(52) ممتاز شیریں، معیار، ص، ۲۷

(53) شمس الرحمٰن فاروقی: "محمد حسن عسکری۔کل اور آج: ایک گفتگو" مشمولہ شب خون، اکتوبر 2002، ص28

(54) ملاحظہ ہوں ان کے مضامین: "پاکستان کا تہذیبی مستقبل" (17/مئی 1948)؛ "پاکستان کا کلچر" (یکم نومبر 1948)؛ "آزادیٔ رائے اور پاکستان کا کلچر" (21 نومبر 1948)، مشمولہ مقالات عسکری، ج 2: اور "تاریخی شعور" (یکم جنوری 1949) مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب

(55) ملاحظہ ہوں عسکری کے تقریباً سب مجموعوں میں فن تعمیر سے متعلق مضامین۔ علاوہ ازیں ان کے 1947ء کے خطوط بنام آفتاب احمد۔

(56) حاشیہ 54 کے مضامین کے علاوہ دیکھیے "مسلمان قوم اور مسلمان ادیب"، "پاکستانی حکومت اور ادیب"، "پاکستانی ادیب" (جھلکیاں) "ہمارا ادبی شعور اور مسلمان" (انسان اور آدمی)؛ "پاکستانی قوم، ادب اور ادیب" (تخلیقی عمل اور اسلوب)

(57) دیکھیے مکتوب بنام آفتاب احمد، 26 مارچ 1954

(58) عسکری کی نظر میں فن کی ماہیت، اس کی انسانی معنویت، اس کے طریق کار کی تفصیل کے لیے دیکھیے: "ادب میں اخلاقی مطابقت 2"؛ "جذبات نگاری"؛ "معروضیت ا"، "ادب اور حقیقت"؛ "جیمز جوئس"؛ "جوئس کا طرز تحریر"؛ "معروضیت 2" مشمولہ جھلکیاں؛ "نظریہ افادیت اور ادب"؛ "افادی ادب"؛ "کامیو اور مقصدی ادب" مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب: "ہیئت اور نیرنگ نظر"؛ "فن برائے فن"؛ "منٹو فسادات پر"، مشمولہ انسان اور آدمی؛ "ستارہ یا بادبان"؛ "ادب یا علاج الغربا"؛ "فنی تخلیق اور درد"؛ "ادب اور جذبات" مشمولہ ستارہ یا بادبان یا "خیر البشر کا نظریہ ادب" مشمولہ مقالات عسکری ج 1؛ "قلم میں رنگ۔ مگر کیوں اور کس لیے" مشمولہ مقالات عسکری ج ۲

(59) ان خیالات کا اظہار ان کی پہلی "جھلکیاں" ہی میں ہے۔ مزید دیکھیے "ادب اور نئی دنیا" اور "تحسین ناشناس" مشمولہ جھلکیاں

(60) تصور انسان کے تحت متن میں جن مضامین کے حوالے سے یہ باتیں کی گئی ہیں انہیں سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا مضامین کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔ نیز اس ضمن میں سلیم احمد کی کتاب محمد حسن۔ عسکری: انسان یا آدمی؟ کے ابواب ۷ اور ۸ بھی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

(61) وقت کی راگنی، ص24

(62) ستارہ یا بادبان، ص150

(63) علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص267

(64) مشمولہ "ذہن جدید" دسمبر 1992ء تا فروری 1993ء؛ مزید دیکھیے ناصر بغدادی، "عسکری صاحب اور اردو ادب کی موت از سرِ نو تجزیہ" مشمولہ ماہنامہ "شاعر"، اپریل 2005ء

(65) مقالاتِ عسکری، ج ۱، ص۳۹

(66) یہ بات ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے راقم سے ایک نجی گفتگو میں کہی تھی۔

(67) تنقید کی آزادی، ص34

(68) تنقید کی آزادی، ص25

(69) عبادت بریلوی، خطوطِ محمد حسن عسکری، ص46؛ عسکری بنام فاروقی مشمولہ روایت اول، ص:96

(70) روایت، شمارہ اول، ص:501

(71) آفتاب احمد، محمد حسن عسکری: ایک مطالعہ، ص:43

(72) فیض کے خط بنام افتخار عارف کے لیے دیکھیے روزنامہ جنگ راولپنڈی، 27 دسمبر 1982ء، اور دیکھیے صفدر میر کے اعتراضات

Zeno, "Rejection of 'Modernism' ", in The Muslim, Islamabad, Sep. 2, 1979; & Annual of Urdu Studies, vol. 1, 1981.

(73) مقدمہ تخلیقی عمل اور اسلوب، ص9

(74) 1994ء میں راقم نے جب سنگ میل والوں کو اس بات کا بتایا تو پہلے تو یہ ماننے میں تامل کیا گیا کہ عسکری کی کوئی تنقیدی کتاب اس کے علاوہ بھی ہے، مگر جب انہیں بتایا گیا کہ "جھلکیاں" کے اصل میں دو حصے ہیں اور دوسرا کراچی سے چھپا ہے تو انہیں اس کا احساس ہوا تھا۔

(75) راقم نے اس امر کی تصدیق ڈاکٹر سہیل احمد خاں سے بھی حاصل کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حیدرآباد دکن کے رہنے والے ایک اور محمد حسن عسکری ہو سکتے ہیں، نقاد عسکری نہیں۔

(76) محمد حسن مثنیٰ: "ایک خط-ایک تعارف" مشمولہ مکالمہ 5، کراچی، ص445

(77) مکتوب مظفر علی سید بنام مشفق خواجہ، 30 مارچ 1983ء اس خط میں مظفر صاحب نے

عسکری پر ایک مجوزہ کتاب کا خاکہ ترتیب دیا ہے جو مشفق خواجہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خط کی کاپی ہمیں مشفق خواجہ مرحوم نے عنایت کی تھی۔ متن میں 'مکتوب مظفر علی سید بنام مشفق خواجہ' کا جو بھی حوالہ ہے وہ اسی خط سے ہے۔

(78) مظفر علی سید، تنقید کی آزادی، ص30

(79) حامد بیگ، مرزا، "محمد حسن عسکری: مترجم، مفکر، روایت شناس" مشمولہ شب خون، دسمبر 2004ء

(80) Lawrence, DH, Studies in Classic American Literature, p.159 ترجمہ از مظفر علی سید، فکشن، فن اور فلسفہ، ص165

(81) یہاں مولانا تقی عثمانی کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے مضمون "استاد پروفیسر حسن عسکری" مشمولہ نقوش رفتگاں اور انگریزی ترجمہ و تفسیر کی پہلی جلد کے مقدمے سے ماخوذ ہے۔

(82) "لارنس کے منتخب نقد ادب پر عسکری کا تبصرہ"، اصل مطبوعہ پاکستان ٹائمز، لاہور، 29 ستمبر 1956ء، اردو ترجمہ مشمولہ مظفر علی سید، فکشن فن اور فلسفہ، ضمیمہ نمبر 1

(83) ان دونوں کتابوں پر عسکری کے دیباچے اب مقالات عسکری ج1 میں بھی شامل ہیں۔

(84) آگے چل کر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز کے اپنے معیار انتخاب کے بارے میں لکھا ہے کہ "میں میر کے کلام کو بقول ڈبلیو بی یٹس مسوں اور مہاسوں کے ساتھ پیش کرنا چاہتا تھا، یعنی ان اشعار کو نظر انداز نہ کرنا چاہتا تھا جو موجودہ تصور غزل کے منافی ہیں" سوال ہے کہ عسکری بھی تو اپنے تئیں "میر کی مکمل یا اگر مکمل نہیں تو نمائندہ تصویر پیش" کر رہے تھے؛ پھر وہ محل اعتراض کیوں؟

(85) یہ خطاب احمد ندیم قاسمی کی کتاب میرے ہم سفر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(86) عباس، ایس جی، پروفیسر محمد حسن عسکری۔ ایک جائزہ، ص57

(87) مہر افشاں فاروقی اور باراں رحمٰن، شمس الرحمٰن فاروقی کی صاحبزادیاں ہیں: مہر افشاں ورجینیا یونیورسٹی میں اردو پڑھاتی ہیں اور باراں جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی (انڈیا) میں انگریزی کی استاد ہیں۔

(88) دیکھیے آصف فرخی کا مضمون "مشرق و مغرب کی آویزش (عسکری صاحب اور اردو ادب میں)" مشمولہ سویرا 76، جون 2004ء

(89) آخر الذکر مقالے کے بارے میں یہ معلومات مقالہ نگار ندیم احمد کے ایک مکتوب بنام محمد حسن مثنیٰ، 15 فروری 2005ء سے ماخوذ ہیں۔

کتابیات

ادیب، سید مسعود حسن رضوی، ہماری شاعری، لکھنو، نولکشور پریس، ۱۹۵۳ء

الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء

امداد امام اثر، کاشف الحقائق (جلد اول و دوم)، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۶ء

انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

آزاد، محمد حسین، آب حیات، لکھنو، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء

بالزاک، بڈھا گوریو، مترجمہ نسیم ہمدانی، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء

تقی عثمانی محمد، نقوش رفتگاں، کراچی، مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۳ء

حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء

سلیم احمد، مشرق، کراچی، مکتبہ نیا ادب، ۱۹۸۹ء

شمیم احمد، زاویہ نظر، کوئٹہ، اردو پبلشرز، ۱۹۸۷ء

صادق، ڈاکٹر محمد، محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء

عالی، جمیل الدین، بس اک گوشۂ بساط، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور کراچی، ۲۰۰۳ء

علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب (پہلی جلد)، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۱ء

فاروقی، شمس الرحمن، شعر شور انگیز، (جلد ۱ تا ۴)، دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰۔۱۹۹۴ء

فتح محمد ملک، پروفیسر، سعادت حسن منٹو۔ ایک نئی تعبیر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

فرخی، ڈاکٹر اسلم، محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، جلد اول و دوم، ۱۹۶۵ء

قاسمی، احمد ندیم، میرے ہم سفر، لاہور، اساطیر، ۲۰۰۲ء

مظفر علی سید، تنقید کی آزادی، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۳ء

مظفر علی سید، کشش فن اور فلسفہ، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۶ء

مظفر علی سید، "ایسے پھر خانماں خراب کہاں"، غیر مطبوعہ خاکہ محمد حسن عسکری۔ (حلقہ ارباب ذوق لاہور، میں پڑھا گیا۔ ہمارے پاس اس کی صوتی ریکارڈنگ محفوظ ہے۔)
ممتاز شیریں، معیار، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء
منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، لکھنو، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۶ء
یونس جاوید، حلقہ ارباب ذوق، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء

انگریزی کتب

(1)Islamia College Founder's Day Souvenir, Mar 2,1966
Lawrence, D.H., *Studies in Classic American Literature*, London, Penguin Books, 1971.
(2)Studies in Tradition, spring 1992, winter 1992, Editor: Qaisar Alam, Karachi, Primordial Publishers.
(3)The Annual of Urdu Studies, (AUS), Vol. 1, 1981 & Vol. 19, 2004, Editor: Muhammad Umar Memon.
(4)http://dsal.uchicago.edu/books/annualofurdustudies/
(5) http://www.urdustudies.com/

رسائل و جرائد

(1) اردو ادب، شمارہ ۱ اور ۲، مرتبین: سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، لاہور، مکتبہ جدید، ۵۰-۱۹۳۹ء
(2) تخلیقی ادب، ادارت پاشا رحمٰن، آمنہ مشفق، مشفق خواجہ، کراچی، شمارہ ۱ تا ۵
(3) ذہن جدید، مدیر جمشید جہاں، دسمبر ۹۲ تا فروری ۱۹۹۳ : مارچ۔نومبر ۱۹۹۵ء
(4) روایت، مدیر محمد سہیل عمر، لاہور، مکتبہ الروایت، شمارہ ۱، ۱۹۸۳ء
(5) سویرا، شمارہ ۷-۸: لاہور، نیا ادارہ

(6) سیارہ، کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء

(7) شاعر، (ماہنامہ)، مدیر افتخار امام صدیقی، بمبئی، اپریل ۲۰۰۵ء

(8) شب خون، مدیر شمس الرحمٰن فاروقی، الہ آباد، اکتوبر ۲۰۰۲ء، نومبر ۲۰۰۳ء، شمارہ ۲۸۷، دسمبر ۲۰۰۳ء

(9) شعر و حکمت، مرتبین: شہریار۔ مغنی تبسم، مکتبہ شعر و حکمت، حیدرآباد، انڈیا، کتاب نمبر ۲، دور سوم، مارچ ۲۰۰۱ء

(10) ماہِ نو، مدیر کشور ناہید، لاہور، مارچ ۱۹۷۸ء

(11) محراب، مرتب سہیل احمد خاں، ۱۹۷۹ء، لاہور

(12) مکالمہ، مدیر مبین مرزا، کراچی، اکادمی بازیافت، شمارہ ۵